فصیلِ شب
منظوم
نو ڈرامے
میرزا ادیب
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

میرزا ادیب کی تخلیقی شخصیت مدوجزر نا آشنا ہے۔ انہوں نے جو ادبی نصب العین اپنایا، اسی کی روشنی میں لکھا اور خوب لکھا۔ "صحرانورد کے خطوط" اور "صحرانورد کے رومان" میں انہوں نے انسان دوستی، حریت پسندی، عشق کی حرماں نصیبی اور حسن کاری کا جو انداز اختیار کیا بعد میں وہی اُن کے تخلیقی شعور کی اساس بنا۔ چنانچہ ان کے افسانوں اور ڈراموں میں ان سب میلانات کے تال میل سے جادو جگایا جاتا ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں سے میرزا ادیب نے خود کو بطورِ خاص ڈرامہ کے لیے وقف کیے رکھا ہے اور ڈراموں کے نصف درجن مجموعے ان کی فن کارانہ کاوشوں کا زندہ ثبوت ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ڈراموں کے ایک مجموعے "پسِ پردہ" پر آدم جی انعام بھی ملا۔ میرزا ادیب نے طویل ڈرامے بھی لکھے ہیں لیکن یک بابی ڈراموں میں خصوصی نام پیدا کیا، اِس اعتبار سے بھی ان کی عطا کم نہیں کہ انہوں نے اس صنف کی ترقی کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر رکھی ہیں۔

"فصیلِ شب" کے ڈرامے ان کی ڈرامہ نگاری کی صلاحیتوں کا نقطۂ عروج قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان میں انہوں نے ہم عصر معاشرہ کے دُکھی افراد کے مرقعے بھی پیش کیے ہیں اور استعمار کے خلاف جدوجہد میں مصروف اقوام کے جذبۂ حریت کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ یوں ان ڈراموں کا مطالعہ بیک وقت قومی اور بین الاقوامی تناظر میں کیا جا سکتا ہے۔ میرزا ادیب نرم دل فن کار ہیں اس لیے اپنے کرداروں سے محبت اور احتیاط کا سلوک کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں کے کردار محض کردار نہیں رہتے بلکہ زندہ افراد کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر

فصیلِ شب
(نو ڈرامے)

میرزا ادیب

سنگ میل پبلی کیشنز۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

تعداد اشاعت: ۱۰۰۰
قیمت: ۳۲/۰۰ روپے
طابع: منظور پرنٹنگ پریس لاہور
ناشر: نیاز احمد
سنگ میل پبلی کیشنز - لاہور
کتابت: محمد اشفاق زاہد

جسٹس ایم کیانی کے نام

فہرس

امّاں ۔ امّاں جان

کردار

اماں

مہراں

مولوی جی

شیداں

مرادو

حسن

اسلم

لالو ماشکی

چودھری صاحب

سٹیج ایک ایسی کوٹھڑی کا نقشہ پیش کر رہی ہے جس کے چپے چپے پر غربت نمایاں ہے۔ یہاں کی کل کائنات ایک چارپائی، ایک پھٹا پرانا بستر، مٹی کا ایک گھڑا اور مٹی ہی کا ایک پیالہ ہے۔ چارپائی کوٹھڑی کے وسط میں ہے اور گھڑا اس سے کچھ دور دیوار کے قریب دکھائی دے رہا ہے۔ پیالہ اس پر اوندھا پڑا ہے۔

چارپائی پر ایک میلی کچیلی دری بچھی ہے۔ پائنتی پر ایک بوسیدہ لحاف پڑا ہے اور لحاف کے اوپر تکیہ۔ جس کی روئی کئی جگہوں سے باہر نکل آئی ہے۔ اماں جیواں چارپائی پر اس طرح نیم دراز ہے، کہ اس کی پشت کا کچھ حصہ لحاف اور تکیے سے لگا ہے اور چہرہ تماشائیوں کی جانب ہے۔

اماں سخت کمزور اور نحیف و نزار بوڑھیا ہے۔ لمبی بیماری نے اس کا سارا خون چوس لیا ہے۔ عمر پچاس ساٹھ کے درمیان ہوگی۔ مگر اس حالت میں ستر سے کم نظر نہیں آتی۔

لباس قمیص شلوار جن کا کسی زمانے میں اپنا رنگ ہوگا۔ اب تو رنگ پہچاننا مشکل ہے۔

وقت :۔ دن کے دس بجے۔

اماں کی کوٹھڑی میں ابھی پوری طرح روشنی نہیں آئی۔ آنے جانے کے لیے دروازہ

بائیں جانب ہے۔ اماں تنہا ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ اس پر کھانسی کا
شدید دورہ پڑا ہے۔ کھانستے کھانستے سر تکئے پر رکھ دیتی ہے۔ چھاتی پر ہاتھ
مارتی ہے۔ پھر سر اٹھا کر حسرت انگیز نظروں سے گھڑے کو دیکھتی ہے۔ اسی
اثنا میں — دروازے سے مہراں داخل ہوتی ہے۔ مہراں قمیص، سویٹر اور
شلوار پہنے ہوئے ہے۔ شانوں پر دوپٹہ ہے۔ عمر تیس کے لگ بھگ۔

اماں :۔ مہراں ! (گھڑے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے)۔ اوہ۔ ہو (ہانپ کر) اوہ۔ اللہ ہو ہو
(دوبارہ سر لحاف پر رکھ کر) ہو ہو۔ مر گئی۔ (مہراں تیزی سے آتی ہے اماں کو شانوں سے
تھام کر بٹھانے کی کوشش کرتی ہے)
پانی مہراں — پانی

مہراں :۔ خالی پیٹ ؟ نہ اماں نہ پیو

اماں :۔ تو زہر کھالوں ؟ — اوہ۔ ہو ہو
(مہراں اماں کے پاس چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے)

مہراں :۔ کھچڑی پک رہی ہے اماں !
(اماں نفی میں سر ہلاتی ہے)

اماں :۔ تمہارے اپنے بال بچے ہیں۔ میرا کیا ہے، آج مری کل دوجا دن (اردگرد دیکھ کر)
کچھ بھی نہیں رہا۔ ہو مولا ! اب تو ختم ہی کر دے۔ مولا جی ! — میرے مولا جی !
(اماں پھر کھانستی ہے اور گھڑے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ مہراں اٹھ کر جاتی ہے۔
پیالے میں کچھ پانی لے کر آتی ہے اور اماں کے منہ سے لگاتی ہے۔ ابھی وہ پی ہی رہی
ہے کہ پیالہ ہٹا لیتی ہے)

مہراں :۔ بس اماں !
(پیالہ زمین پر رکھ دیتی ہے)

اماں :۔ توبہ میری ۔ استغفار

مہراں :۔ ابھی کھچڑی پک جاتی ہے

اماں :۔ تمہارے گھر میں بھی تو بھوک ننگ ہے۔ پتہ نہیں کس طرح گزارا ہوتا ہے۔ اللہ کرے سو کر نہ اٹھوں۔

(ہاتھ سے آنسو خشک کرتی ہے)

مہراں :۔ نہ رو اماں !

(مہراں دوپٹے کے دامن سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگتی ہے)

اس نیلی چھت والے پر بھروسہ رکھو

اماں :۔ اب تو موت ہی آجائے ۔ ہر گھڑی راستہ دیکھ رہی ہوں ۔ نہیں آتی ۔ نہیں آتی مہراں!

(مایوسی میں سر لحاف پر ٹیک دیتی ہے)

مہراں :۔ اماں

اماں :۔ میں جیتی کب ہوں ۔ نہ آدم نہ آدم زاد ۔ زمانہ گزر گیا ۔ سوائے تمہارے کوئی آیا ہی نہیں ۔ پتہ نہیں شہر میں ہوں کہ جنگل میں ۔ قبر میں پڑی ہوں ۔

مہراں :۔ اماں کون پوچھتا ہے کسی کو ۔ (آہ بھرتی ہے) بڑا برا زمانہ آگیا ہے ۔

اماں :۔ پتہ نہیں میرا مردہ بھی لے جائیں گے یا نہیں کہ یہیں پڑا سڑتا رہے گا !

(مہراں کچھ جواب نہیں دیتی ۔ چپ چاپ اماں کو دیکھتی رہتی ہے)

اچھا (آہ بھر کر) یہ دن بھی دیکھنے تھے ۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

مہراں :۔ (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) کون ہے !

اماں :۔ (لحاف سے سر اٹھا کر) ہمارے دروازے پر ہے کوئی ؟ (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) یہاں کون آئے گا ۔ اس قبرستان میں کون آئے گا !

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

مہراں :۔ کوئی ہے اماں !

اماں :۔ یہاں تو کوئی کتا بھی نہیں آتا۔ آدمی کہاں آتا ہے ۔ لالو ماشکی نہ ہو۔ پر اسے تو روپیہ دے دیا تھا اماں ؟

مہراں :۔ دے دیا تھا اماں !

(مہراں اٹھتی ہے)

اماں :۔ میں نے کہا چوتھے پانچویں دن گھڑا بھر جاتا ہے ۔ اس کا حق دے دوں !

(مہراں دروازے کے باہر جاتی ہے اور جلدی ہی واپس آجاتی ہے)

مہراں :۔ مولوی جی !

اماں :۔ مولوی جی ۔ ؟

مہراں :۔ سچ مولوی جی آئے ہیں۔

اماں :۔ پر میں تو مری نہیں ابھی۔

(مولوی جی آتے ہیں۔ بالشت بھر داڑھی۔ اچکن پہنے ہوئے۔ سر پہ پگڑی، ہاتھ میں چھڑی)

مولوی جی :۔ (دروازے پر آتے ہی) السلام علیکم و رحمتہ اللہ

(مہراں اماں کو دیکھتی ہے کہ سلام کا جواب دے اور اماں حیران ہو کر دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ مولوی جی آگے آتے ہیں)

اماں جی ! کیا حال ہے ؟

(اماں ! ابھی تک حیران ہے کوئی لفظ نہیں کہتی)

مہراں :۔ اماں ! مولوی جی کہتے ہیں کیا حال ہے ؟

اماں :۔ ہیں ؟

(مہراں تیزی کے ساتھ دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔ مولوی جی چارپائی کے پاس آتے ہیں)

مولوی جی :۔ اماں جی !

اماں :۔ (بلند آواز سے) مہراں !— کہاں چلی گئی —

(اماں پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھتی ہے)

مولوی جی :۔(ایک طرف چارپائی پر بیٹھے ہوئے) ادھر — خدا رحم کرے (منہ میں کچھ پڑھ کر اماں پر پھونکتے ہوئے) کچھ زیادہ تکلیف تو نہیں ؟

اماں :جی مولوی جی !

(مہراں کرسی لے کر آتی ہے اور چارپائی کے پاس لا کر رکھ دیتی ہے۔ پھر مولوی جی کو اس طرح دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو "کرسی میں بیٹھ جائیں")

مولوی جی :۔ میں تو اماں جی کے پاس ہی بیٹھوں گا۔ (اماں سے مخاطب ہو کر) اماں

(اماں خاموش رہتی ہے)

مہراں :۔ (چہرہ اماں کے قریب لے جاتے ہوئے) اماں بولو نا — مولوی جی کیا کہہ رہے ہیں !

اماں :۔ کیا کہہ رہے ہیں ۔ ؟

مہراں :۔ مولوی جی سے بولو۔

اماں :۔ اچھا اچھا — مولوی جی ! میں بڑی غمخوار ہوں ۔

مولوی جی :۔ گناہ گار تو میں ہوں اماں — آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں ۔

(اماں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مولوی صاحب نے کیا کہا ہے ۔ وہ ان کے چہرے کو تک رہی ہے ۔ مولوی جی عاجزانہ چہرہ بنا کر کہتے ہیں)

مجھے معاف کر دیجئے ۔ اماں

اماں :۔ مہراں ! مولوی جی کیا کہتے ہیں ؟

(مہراں مولوی جی کے الفاظ پہ خود حیران ہے ۔ خاموش رہتی ہے)

مولوی جی :میں واقعی بہت شرمندہ ہوں ۔

(مولوی جی جیب سے رومال نکال کر پیشانی پونچھنے لگتے ہیں)

اماں! تم حیران ہو گی کہ میں سے کیسی معافی مانگ رہا ہوں۔ مگر فی الواقعی میں بڑی شرمندگی کے ساتھ معافی مانگنے آیا ہوں۔

(اماں اور مہراں ۔ دونوں ٹکٹکی باندھ کر مولوی جی کو دیکھ رہی ہیں)

بات یہ ہوئی اماں کہ رات تہجد پڑھ کر سویا ہی تھا کہ خواب میں میرے حضرت پیر و مرشد آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے مبارک چہرے پر کچھ خفگی اور ناراضی کے آثار ہیں مجھے بڑا دکھ ہوا۔ عرض کی حضور! مجھ گناہگار سے کیا قصور سرزد ہوا ہے کہ آپ ناراض ہیں۔ حضرت بولے۔ "احمد علی! تیرے محلے میں اللہ کی ایک نیک بندی تکلیف میں مبتلا ہے اور تجھے خبر نہیں۔ جا اس کی خدمت کر"

(مولوی جی ذرا ٹھہر جاتے ہیں)

اماں! (بڑی عاجزی سے) مجھے معافی دے دو۔ آج سے تمہارا خادم ہوں۔ جو بھی خدمت ہو بتاؤ۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے بڑا شرمندہ ہوں۔

اماں:۔ میں تو بڑی ہی عنہ مغار ہوں مولوی جی!

مولوی جی:۔ اماں! یہ میرے حضرت پیر و مرشد کا حکم ہے کہ تمہاری خدمت کروں

اماں:۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔

مولوی جی:۔ اللہ بھلا تب کرے گا جب تم بھلا کرو گی

مہراں:۔ روز کہتی تھی میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے آج خدا نے سن لی ہے۔ ہے نا اماں؟

مولوی جی:۔ (اماں کا ہاتھ پکڑ کر) میں تو اماں کا بیٹا ہوں۔ اماں! میرے غریب خانے پر چلو نا۔ وہاں اطمینان کے ساتھ خدمت کر سکوں گا۔

اماں: کیا تمہارے گھر جاؤں؟ نہ مولوی جی۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔

مولوی جی: میرا غریب خانہ تمہارا گھر نہیں ہے؟

اماں :۔ آخری گھڑیاں یہیں بیت جائیں تو اچھا ہے۔

مولوی جی :۔ یہاں تمہیں تکلیف ہے نا ۔ وہاں سب گھر والے رات دن تمہاری خدمت کریں گے۔

کیا خبر اسی بہانے ہماری عاقبت بھی سدھر جائے ۔ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

اماں :۔ اب کہاں جاؤں گی ۔ قبر کنارے پہنچ گئی ہوں ۔

مہراں :۔ اماں آخر حرج کیا ہے ۔ مولوی جی کہتے ہیں ۔

اماں :۔ مہراں ! تو دیکھتی نہیں ۔ چلا کہاں جاتا ہے مجھ سے ؟

مولوی جی :۔ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا میں گود میں اٹھا لوں گا اپنی اماں کو

(مہراں مسکراتی ہے ۔ اماں نفی میں سر ہلاتی ہے)

اچھا تمہاری مرضی ۔ مجھے تو خدمت ہی کرنی ہے وہ یہاں بھی ہو سکتی ہے ۔ علاج کس کا ہو رہا ہے ؟

مہراں :۔ آج کل تو کسی کا نہیں ۔ پہلے اشرف کی دوکان سے دوا لے آتی تھی ۔

مولوی جی :۔ اشرف ہے وہ تو عطار ہے ۔ خیر کسی مستند حکیم سے مشورہ کر لیں گے ۔

اچھا اماں ۔ کوئی خدمت بتاؤ نا ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دو ۔ کھانا تو صبح شام میرے غریب خانے ہی سے آئے گا

اماں :۔ (بہت متاثر ہو کر) بڑی مہربانی تیری مولوی صاحب جی !

مہراں :۔ کھچڑی پکائی ہے ۔ اب تو وہی کھائے گی ۔

مولوی جی :۔ نہیں ۔ میرے گھر سے کھانا آئے گا ۔

(مولوی جی اٹھتے ہیں)

دوپہر کو آؤں گا ۔ اب ذرا خاں صاحب کی بڑی لڑکی کو قرآن شریف پڑھانا ہے ۔

کھانا لیتا آؤں گا ۔

مہراں :۔ میں نے کھچڑی پکا لی ہے آج تو ۔

مولوی جی :- خیر۔ کچھ اور چنیرے آویں گا۔ بازار میں کس پھل کی کمی ہے ؟ ۔ اچھا اماں

اماں :- مولا بھلا کرے تیرا۔

(مولوی جی دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ کچھ دور جاکر رُک جاتے ہیں)

مولوی جی :- کوئی فکر نہ کرنا۔ اماں ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

(اماں اثبات میں سر ہلاتی ہے مولوی جی دروازے میں سے نکل جاتے ہیں)

مہراں :- (چارپائی پر بیٹھ کر) دیکھا اماں ! (اماں مہراں کو غور سے دیکھتی ہے)

تو رات دیر تک روتی رہی تھی ناں۔ یہ اس کا اثر ہے۔ اللہ نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا

تیرے پاس۔ اور کیا کہتی ہے تو؟

اماں :- اس بے نیاز کے ڈھنگ نرالے ہیں۔

مہراں :- پر اماں ! ایک بات ہے۔ تو ضرور اللہ کی پیاری بندی ہے مولوی جی کو حضرت پیر

مرشد نے خواب میں آکر ہدایت کی ہے۔

(اماں پہلی بار مسکراتی ہے۔ باہر سے ایک نسوانی آواز " اماں " کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔

مہراں اور اماں ایک دوسری کو اس انداز سے دیکھتی ہیں جیسے پوچھ رہی ہوں کہ کون

آیا ہے)

مہراں :- (دروازے کی جانب دیکھ کر) کون ہے ؟

آواز :- میں ہوں۔ شیداں !

مہراں :- شیداں آئی ہے اماں

اماں :- شیداں کون ؟

مہراں :- ہائے شیداں بھول گئی ہو وہی نا۔ لالو ماشکی کی گھر والی اور کون؟

اماں :- اچھا

(شیداں اندر آچکی ہے۔ بتیس بتیس برس کی عورت دبلی ۔ پتلی ۔ لباس ۔ شلوار قمیص اور دوپٹہ)

مہراں :- (مسکرا کر) اماں پوچھتی تھی - شیداں کون ہے ؟

شیداں :- (آگے بڑھ کر) ہائے اماں - سچ مجھے نہیں جانتی تو ؟

اماں :- بڑھاپے اور بیماری نے انجر پنجر ڈھیلا کر دیا ہے پھر تم آئی بھی تو نہ جانے کتنے مہینوں بعد ہو ناں

شیداں :- اماں! تجھے کیا خبر - ہم پر تو بپتا کا وقت پڑا ہے - دار اٹانگے میں آگیا - میرے شانے پر پھوڑا نکل آیا - کچھ نہ پوچھو - کیا حال رہا - تم کہو اماں! کیا حال چال ہے ؟

اماں :- جی رہی ہوں - موت راستہ بھول گئی ہے

شیداں :- رب سے خیر مانگو - موت جائے تمہارے دشمنوں کے گھر - ہاں

اماں :- پر شیداں ! آج میں یاد کیسے آگئی -- ؟

شیداں :- اللہ جانتا ہے اماں - میرے اور دارے کے جاپے کے دل میں تمہارا کتنا پیار ہے - زبان سے کیا کہوں ؟

اماں :- لالو تو جو تھے پانچویں دن گھڑ بھر جاتا تھا پر تم نے کبھی صورت نہ دکھائی -

شیداں :- اچھا اماں ! پچھلی باتیں ماف کر دے - اب کہو گی تو دن رات یہیں پڑی رہوں گی - جانے کا نام ہی نہ لوں گی ہاں -- (مسکرا کر) خود ہی تنگ آ جاؤ گی -

(اماں کے پاؤں دبانے لگتی ہے)

اماں :- ہائے خائے یہ کیا کرتی ہو ؟

شیداں :- (روٹھ کر) دیکھو اماں ! یہ بری بات ہے - ہم غریب اور کیا کر سکتے ہیں - بس یہی نا ! بزرگوں کی کچھ خدمت کر دیں بس -

اماں :- پہلے تو کبھی یہ خیال نہیں آیا تجھے ؟

شیداں :- ہائے اللہ ! -- اماں مانتی نہیں دیتی - مہراں !

(مہراں پاس کھڑی مسکرا رہی ہے)

مہراں :۔ تم جانو اور اماں مجھ سے کیا کہتی ہو؟

شیداں :۔ اماں ! میں اگلی پچھلی ساری کسر نکال دوں گی۔

اماں :۔ اللہ بھلا کرے مہراں کا ۔ اسی کے سہارے سانس لے رہی ہوں۔ تم لوگوں نے تو مجھے یوں چھوڑ دیا ۔ جیسے آدمی نہیں ، مردار کتا ہوں ۔ جسے گھر سے باہر پھینک دیتے ہیں۔

شیداں :۔ توبہ آ ہ ۔ اماں کیا کہہ رہی ہے ۔ کلیجہ ہی جل گیا ہے میرا ۔ !

اماں :۔ سچی بات کہتی ہوں ۔ جھوٹ کیوں بولوں بھلا ؟

شیداں :۔ اچھا بابا اب مافی دے دے ناں ۔ (کانوں پر انگلیاں رکھ کر) اب کبھی ایسا نہ ہوگا۔ باپ دادا کی قسم۔

(شیداں زور زور سے پاؤں دبانے لگتی ہے)

ہائے وہ تو یاد ہی نہیں رہا۔

(شیداں دوپٹے کا پلو کھولتی ہے ۔ اس میں سے سیب کے دو ٹکڑے ، دو ٹکڑے امرود کے آدھا کیلا۔ رنگترے کی چند پھانکیں اور کچھ میٹھے چنے نکالتی ہے)

تیرے لیے لائی تھی ۔ مسجد میں " یارھویں کا ختم " ہوا تھا رات کو۔

اماں میرے دانت کہاں ہیں ؟

شیداں کیلا تو کھا سکتی ہے ناں

(شیداں کیلے کا چھلکا اتار کر گودا اماں کو دیتی ہے ۔ اماں منہ میں ڈالتی ہے)

امرود کھائے گی ؟

(اماں نفی میں سر ہلاتی ہے)

ٹھہر کر کھا لینا۔

(شیداں باقی چیزیں چارپائی پر ایک طرف رکھ دیتی ہے)

اماں :۔ مہراں بچوں کے لیے لے جا۔

شیداں:۔ بچے کھاتے ہی رہتے ہیں۔ (شرمندہ ہو کر) میرا مطلب ہے تو کھا اماں!

(مائی مرادو آتی ہے۔ آنکھوں پر عینک، بغیر کسی تکلف کے چارپائی کے پاس پہنچ کر اماں کو غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ پھر یوں سر ہلاتی ہے، جیسے کوئی بات سمجھ گئی ہے)

مرادو:۔ ٹھیک ٹھیک!

مہراں:۔ کیا ٹھیک ہے ماسی!

مرادو:۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔

مہراں:۔ (مسکرا کر) کیا پہیلی بجھا رہی ہے ماسی!

مرادو:۔ (اماں کے پاس بیٹھ کر) اماں تو نہیں جانتی تیرے اندر کیا خرابی ہے۔

(مرادو اماں کے پیٹ پر ہاتھ رکھتی ہے۔ اماں جلدی سے ہاتھ ہٹا دیتی ہے)

اماں:۔ میرے اندر ایک نہیں ہزار خرابیاں ہیں۔ پر تو رستہ بھول کر کہاں آ گئی مرادو!

مرادو:۔ آج تو مجھے سیدھا رستہ نظر آیا ہے اماں! اب تو ہو گی اور یہ تیری (اپنے سینے پر ہاتھ مار کر) نوکرانی ہو گی۔

اماں:۔ پیر مرشد آیا خواب میں؟

مرادو:۔ میرا پیر مرشد تو وہ (اوپر انگلی اٹھا کر) عرش والا ہے۔ سچ پوچھو اماں تو مجھے آج ہی پتہ لگا ہے کہ تم بیمار ہو۔ اپنے ہی بکھیڑے ختم نہیں ہوتے ایک مصیبت ختم ہوتی نہیں کہ دوسری آ دباتی ہے۔ جب تک دم ہے یہ مصیبتیں ختم نہ ہوں گی۔ اب تو خواہ کچھ ہو جائے، سب سے پہلے تمہاری سیوا کروں گی۔

اماں:۔ (شیداں کی طرف اشارہ کرکے) یہ بھی سیوا کرنے کے لیے آئی ہے۔

مرادو:۔ مجھے کسی سے کیا جو جیسا کرے گا۔ ویسا پھل پائے گا۔

شیداں:۔ ہاں ماسی! پھل صرف تیرے لئے ہی ہے۔

مرادو:۔ میں نے تو کہا ہے۔

شیداں :۔ (جلدی سے) جانتی ہوں جو کچھ کہا ہے۔

مرادو :۔ تم بھی خدمت کرو۔ کون روکتا ہے تمہیں۔ پر خدمت خدمت میں فرق ہوتا ہے۔

شیداں :۔ جی ہاں۔ (طنزاً) بڑا فرق ہوتا ہے۔

مرادو :۔ (شیداں کے الفاظ نظر انداز کرتے ہوئے) اماں! چھاتی میں تو درد نہیں ہوتا؟

(اماں اثبات میں سر ہلاتی ہے)

اچھا شام کے بعد مالش کردوں گی۔ اور پیٹ میں بھی گڑبڑ ہے کچھ؟

اماں :۔ یہ تو تو دائی ہے۔ ڈاکٹر کب سے بن گئی؟

شیداں : ہونہہ

(مرادو غصے سے شیداں کی جانب دیکھتی ہے)

مرادو : کوئی جلتا ہے تو جلے۔ میں نے تو اماں پورے تین سال بڑے ڈاکٹر کے ساتھ کام کیا ہے۔ تمہارا علاج، دیکھنا کس طرح کرتی ہوں آرام نہ آیا تو سات جوتوں کی سزا دینا!

انشاء اللہ سب بیماری ویماری دور ہو جائے گی۔ مجھ کم بخت کو تو پتہ ہی نہ تھا۔

یہ تکلیف تمہیں ہوتی ہی کیوں۔ سچی بات یہ ہے۔ کسی لالچ کے لیے خدمت نہیں

کرتی۔ اللہ نے دل ہی ایسا دیا ہے کہ دوسروں کا دکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔!

(شیداں پیچ و تاب کھاتی رہتی ہے)

شیداں :۔ سچ کہتی ہو بہن!

مرادو :۔ تو اور کیا جھوٹ کہتی ہوں۔ دیکھ لو گی اپنی آنکھوں سے ذرا سنا کہ اماں بیمار ہے تو پل

بھر ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ بھاگی آئی (اماں سے مخاطب ہو کر) اماں کہتی ہو تو ڈاکٹر بھی گھر

لے آؤں۔ میری بڑی مانتا ہے۔

اماں :۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔ ڈاکٹر واکٹر نہ لانا

مرادو :۔ وہ تو میں نے تمہاری تسلی کے لیے کہا ہے۔ علاج تمہارا تو میں خود ہی کر سکتی ہوں۔

اور کر دوں گی۔

(مرادو کن انکھیوں سے شیداں کو دیکھتی ہے۔ جو اماں کا ایک ہاتھ دبا رہی ہے)

(باہر سے حسن کی آواز آتی ہے)

حسن :۔ اماں!

(اماں جہراں کی طرف دیکھتی ہے۔ جہراں یوں سر ہلاتی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہے" پتہ نہیں کون ہے"۔ حسن کی دوبارہ آواز آتی ہے)

اماں!

مرادو :۔ حسن کی آواز لگتی ہے۔۔ کیا کرنے آیا ہے بھلا؟

(حسن اندر آجاتا ہے۔ کوچوان کے لباس میں ملبوس۔ ہاتھ میں ایک تھیلا جس میں کوئی چیز پڑی ہے حسن اندر آکر مرادو اور شیداں کو دیکھ کر ایک دو لمحے کے لیے ٹھٹک جاتا ہے۔ اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر تھیلا ایک طرف لحاف پر رکھ کر" اماں" کہتا ہوا اماں سے لپٹ جاتا ہے)

اماں :۔ (حسن کے بازو ہٹاتے ہوئے) دفعہ دور۔ مُردار آج آگیا ہے۔

حسن :۔ اماں تو سچ مچ بیمار ہے!

اماں :۔ نہیں بہانہ کر رہی ہوں۔ پر آج یہ جوش کہاں سے آگیا تم میں؟

حسن :۔ اماں تو جانتی ہے۔ صبح سویرے تاروں کی چھاؤں تانگہ لے کر نکلتا ہوں اور رات کے یاراں باراں بجے آتا ہوں۔ آج رکھی نے بتایا۔ کہ اماں بیمار ہے۔ تو بڑا غصہ آیا کہ میری اماں بیمار ہو اور مجھے خبر نہ ہو۔

(مرادو مسکرا کر منہ پھیر لیتی ہے)

اماں :۔ تو اب کیا کرنے آیا ہے۔

حسن :۔ پُتر ماں کے پاس کیوں آتا ہے؟

(ماں مسکرا کر سر ہلاتی ہے)

اماں! تو نہیں مانتی — اچھا آج ہی تانگہ بیچ کر یہاں آجاتا ہوں! - تیرے دوارے۔
اب تو خوش ہے نا!

اماں :- کیوں تانگہ کیوں بیچے گا؟

حسن :- تو جو الٹ پلٹ باتیں کرتی ہے۔

اماں :- اچھا کچھ نہیں کہتی۔

حسن :- میں تو تجھے اپنی سگی ماں سمجھتا ہوں۔ میری ماں تو (دونوں ہاتھوں سے ایک بچے کا قد بنا کر) جب اتنا سا تھا مر گئی تھی۔ بڑی آس تھی۔ کہ ماں ہوتی (منہ اماں کے قریب لا کر) تو میری ماں ہے ناں :-

اماں :- پر کیا فیدہ۔ کسی اور کو ماں بنا لے۔ میں تو مر رہی ہوں

مرادو :- ہائے خائے پھر وہی بات۔ اماں کو تو وہم ہو گیا ہے۔ خواہ مخواہ

حسن :- ابھی وہم دور کرتا ہوں۔

(تھیلا اماں کی گود میں الٹ دیتا ہے۔ اس میں سے سیب، رنگترے، کیلے اور مالٹے نکل آتے ہیں)

یہ سب تیرے لئے ہیں اماں! کھا اور موٹی جا!

(شیداں اور مرادو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پھل کو دیکھتی ہیں)

شیداں :- پھل تو میں بھی لائی تھی۔ اماں کھا ہی نہیں سکتی۔

اماں :- میرے دانت کہاں ہیں کہ پھل کھاؤں!

حسن :- کوئی بات نہیں اماں! کل سے پھلوں کا شربت لایا کروں گا۔ گلاس بھر کر وہ تو پی لے گی ناں! - (کیلا اٹھا کر) لے کیلا تو کھا لے۔

اماں :- ابھی کھایا ہے۔

حسن : اماں! ایسا کیلا تو سارے بازار میں نہیں ہے۔ سارے شہر میں نہیں ہے۔

(حسن کیلے کا چھلکا اتارتا ہے)

اماں :۔ رہنے دے۔ ابھی نہیں کھاؤں گی۔

حسن :۔ کیوں اماں! ذرا دیکھ تو سہی۔

(اماں تھوڑا سا گو دالے کو منہ میں ڈالتی ہے)

اماں :۔ بس۔

(حسن پھل دوبارہ تھیلے میں ڈال دیتا ہے)

حسن :۔ ٹھہر کر کھا لینا۔ نہیں

(دروازے پر لالو ماشکی آتا ہے۔ اس وقت وہ خالی مشک اٹھائے ہوئے ہے)

لالو :۔ پانی ہے اماں کہ گھڑا بھر دوں!

مہراں :۔ گھڑا بھرا ہوا ہے۔

لالو :۔ تازہ پانی بھر دوں؟

اماں :۔ کیا کرنا ہے۔

شیداں :۔ ذرا ٹھہر کر بھر دینا۔

(شیداں اور لالو ایک دوسرے کو خاص نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لالو چلا جاتا ہے)

اوخو! اماں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔

(شیداں دوپٹے کی گرہ کھولتی ہے۔ اس میں سے ایک روپیہ نکلتا ہے)

لے اماں! دارے کے چاچے نے کہا تھا۔ اماں کو دے دینا۔ بھلا اپنی ماں سے پیسہ دھیلا کون لیتا ہے؟

اماں :۔ نہ میں تو نہیں لیتی۔

شیداں :۔ وہ کیوں؟ اماں تم اس کا غصہ نہیں جانتیں۔ مجھ سے لڑے گا۔ وہ تو کہتا تھا۔ اماں

سے پوچھنا۔ پیسے دھیلے کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔

مرادو :۔ اس نے تو کچھ کہا نہیں۔ ابھی ابھی آیا نہیں تھا!

شیداں :۔ وہ تو پانی کا پوچھنے آیا تھا۔ پھر مجھے جو اس نے کہہ دیا تھا۔ خود کیا کہتا۔ (ہاتھ ہوا میں ہلا

نہ بابا! ہمیں ڈھنڈورا پیٹنے کی عادت نہیں۔ یہ عادت اور لوگوں کو مبارک ہو۔

اماں :۔ پر شیداں! تمہارے بھی تو بال بچے ہیں۔

شیداں :۔ مولا کریم دینے والا ہے۔ اماں۔ ایک روپیہ دے دینے سے کال نہیں پڑ جائے گا۔ میرا

کمانے والا زندہ ہے۔

(شیداں روپیہ تکئے پر رکھ دیتی ہے)

ایک روپیہ کیا۔ اماں پر ہزاروں روپے بھی قربان ہیں۔

مرادو :۔ سب ۔ جان ۔ اللہ

(شیداں شعلہ ناک نظروں سے مرادو کو دیکھتی ہے۔ یکایک باہر سے اسلم کی آواز آتی ہے)

اسلم :۔ ہو اماں جی!

(سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھتی ہیں۔ جہاں سے اسلم آتا ہے۔ اسلم پہلوان قسم کا آدمی

ہے۔ ٹھگنا قد۔ گٹھا ہوا جسم۔ ہاتھوں میں دودھ سے بھرا ہوا بڑا سا پیالہ۔ اسلم ایک لمحے کے

لیے ٹھٹکتا ہے۔ پھر اندر آنے لگتا ہے)

سلاماں لیکم ہو اماں جی!

اماں :۔ جی آیاں نوں۔

(شیداں، حسن اور مرادو پیالے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں)

اسلم :۔ اماں! سنا ہے تو ذرا بیمار ہے۔

اماں :۔ ابھی ذرا بیمار ہوں۔ ایک دو دن اور ٹھہر جاتے۔ اماں کو کندھا دینے ہی آتے!

(اسلم چارپائی کے پاس آکر دیکھتا ہے کہ کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ کرسی پر ہی بیٹھ جاتا ہے)

اسلم : اچھا اماں! اور باتیں پھر کرلینا۔ پہلے یہ پی لو۔

(پیالہ اماں کی طرف بڑھاتا ہے)

اماں :۔ (ہاتھ سے پیالہ پرے ہٹاتے ہوئے) تیرا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا اچھے!

مرادو :۔ ہائے خدایا! کیوں مارتے ہو بے چاری کو۔ دودھ پی سکتی ہے اس حالت میں؟

اسلم :۔ کوئی ایسا ویسا دودھ نہیں ہے۔ میری اپنی بھینس کا ہے۔ پاپئی تو ملائی ہے اس کے اندر۔ پی کر دیکھ تو سہی اماں!

مرادو :۔ کھانسی میں دودھ زہر ہوتا ہے۔ زہر۔

(شیداں اثبات میں سر ہلاتی ہے)

اسلم :۔ (مرادو کو گھور کر) تمہیں کیا خبر ہے۔ بڑی آئی ڈاکٹر بن کر۔ دودھ تو لاکھ بماریوں کی ایک دوا ہے۔ حکیم ڈاکٹر مریضوں کو دودھ ہی دیتے ہیں۔

مرادو :۔ کھانسی والے مریضوں کو نہیں دیتے۔

اسلم :۔ کھانسی کیا چیز ہوتی ہے دودھ کے سامنے۔ ایسا دودھ سارے شہر میں کہیں نہیں ہوگا۔

حسن :۔ اماں نے ابھی پھل کھائے ہیں۔ دودھ ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔

اسلم :۔ کون کہتا ہے ٹھیک نہیں ہے۔ یہ پی کر کے تو آدمی پلوان بن جاتا ہے میری طرح۔

(اسلم سینہ پھلا کر حسن کو دیکھتا ہے)

اماں :۔ اچھا رکھ دو۔ جی چاہا تو ایک آدھ گھونٹ پی لوں گی۔

اسلم :۔ تھوڑا سا پی لے۔ پا آدھ سیر۔

اماں :۔ ہائے اللہ۔ اتنا کیسے پی سکتی ہوں۔

اسلم :۔ ذرا منہ لگا کر دیکھ تو سہی اماں! میرا دل کہتا ہے۔ اس دودھ سے تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

مرادو :۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ واہ!

اسلم :۔ (مرادو کو غصے سے دیکھ کر) تو مت بول ماسی ! اماں میری ہے۔

اماں :۔ اب تک تو اماں یاد نہ آئی۔

اسلم :۔ ایک کیس کے چکر میں پھنسا رہا اماں۔

اماں :۔ اچھا اسے رکھ دے۔

اسلم :۔ تھوڑا سا پی لے اماں !

اماں :۔ بڑا تنگ کرتا ہے تو اچھے !

مرادو :۔ اسلم :۔

(مرادو کچھ کہنا چاہتی ہے کہ اسلم کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتا ہے اور وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اماں ایک گھونٹ پی لیتی ہے)

اماں :۔ بس

اسلم :۔ بس۔ صرف ایک گھونٹ اور

(اماں یوں سر ہلاتی ہے۔ جیسے کر رہی ہے "کافی ہے" اسلم پیالہ ایک طرف رکھ دیتا ہے)

اماں : اور کچھ نہ کھایا کر۔ یہی دودھ پی لیا کر۔ بھینس تیرے دروازے پہ باندھ دوں گا۔ ٹھیک ہے نا اماں۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ جاتی ہیں)

حسن :۔ (بلند آواز سے) کون ہے (آہستہ) پتہ نہیں کون ہے۔

اسلم :۔ جو ہو گا۔ آجائے گا۔

(دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے)

اماں :۔ دیکھو مہراں

(مہراں باہر جاتی ہے اور جلدی سے لوٹ آتی ہے)

مہراں :۔ اماں۔ چودھری صاحب جی !

اماں :- چودھری صاحب ؟

مہراں :- ہاں اماں -

(اماں تکیئے سے سر ہٹا لیتی ہے - باقی لوگ استفسار طلب نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں - چودھری صاحب آتے ہیں - لباس تہبند ، قمیص ، سر پر طرّے والی پگڑی انہیں دیکھتے ہی اسلم کرسی خالی کر دیتا ہے)

چودھری صاحب :- (حسن سے) تم لوگ ذرا ٹھہر کر آ جانا - حکیم صاحب آ رہے ہیں -

(اسلم ، حسن ، شیداں ، اور مراد دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں - چودھری صاحب اماں پر جھکتے ہیں)

اماں جی ! کیا حال ہے ؟

(مہراں پاس کھڑی مسکرا رہی ہے - اماں اثبات میں سر ہلاتی ہے)

مہراں :- اماں !

اماں :- ہاں -

مہراں :- چودھری جی کیا پوچھتے ہیں ؟

اماں :- بڑی مہربانی -

(مہراں کرسی آگے کر دیتی ہے - چودھری صاحب اماں کے پاس چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں)

چودھری صاحب :- مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا - کہ اماں بیمار ہے (مہراں سے) حکیم صاحب باہر کھڑے ہیں - اندر بلا لاؤ -

(مہراں باہر جانے لگتی ہے)

بڑا افسوس ہے اماں ! ہماری زندگی میں تمہیں تکلیف ہوئی - آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں - (دروازے کی طرف دیکھ کر) آیئے حکیم صاحب !

(مہراں آتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے حکیم صاحب آتے ہیں)

یہ ہے حکیم صاحب ہماری اماں۔

حکیم صاحب:۔ بڑی سعادت مندی ہے آپ کی جو اسے اپنی اماں کہتے ہیں۔

(حکیم صاحب آگے بڑھ کر اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اماں کی نبض دیکھتے ہیں)

ہوں ــ ٹھیک ٹھیک

(دروازے پر لالو ماشکی آتا ہے اور یہ منظر دیکھ کر چپ چاپ چلا جاتا ہے)

کھانسی آتی ہے؟

مہراں:۔ بہت زیادہ حکیم جی!

چودھری صاحب:۔ جلدی ٹھیک ہو جائے گی نا اماں

(دروازے پر لالو ماشکی آتا ہے اور پھر یہ منظر دیکھ کر چلا جاتا ہے)

حکیم صاحب:۔ ہاں ہاں ــ کیوں نہیں؟

چودھری صاحب:۔ (اماں سے) اماں حکیم صاحب کہتے ہیں۔ سب بیماری دیماری دور ہو جائے گی۔

اماں:۔ (آہ بھر کر) اب کیا دور ہو گی؟

(چودھری صاحب تسلی دینے کے انداز میں اماں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر)

چودھری صاحب:۔ بالکل فکر نہ کرو اماں! تمہارا پورا پورا علاج ہو گا ــ (حکیم صاحب سے) اچھا حکیم صاحب! شکریہ۔ دوا تیار رکھیں۔ ملازم جا کر لے آئے گا۔

حکیم صاحب:۔ بہتر۔

(حکیم صاحب جانے لگتے ہیں)

چودھری صاحب:۔ ایک منٹ۔

(چودھری صاحب جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ اور چند نوٹ نکال کر حکیم صاحب کی طرف بڑھاتے ہیں)

حکیم صاحب :۔ شکریہ !

(حکیم صاحب نوٹ لے کر جانے لگتے ہیں)

چودھری صاحب :۔ (اماں سے) میں پچھلے چھ سات مہینے گھر سے باہر رہا ورنہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوتی۔

اماں : اللہ تمہارا بھلا کرے۔ میں رنڈی۔ نہ بیٹی نہ بیٹا۔ عاجز، مسکین محتاج۔ اللہ نے تم لوگوں کے دلوں میں رحم ڈال دیا۔ اتنا دے اللہ کہ سمیٹ نہ سکو۔

(اماں انگلیوں سے آنسو پونچھتی ہے)

چودھری صاحب :۔ اماں اب سب دکھ دور ہو جائیں گے۔ تمہیں آرام کی بڑی ضرورت ہے۔ میری مانو تو میرے گھر چلی چلو۔ منگواؤں ڈولی !

اماں :۔ اب کیا کسی کے گھر جاؤں گی۔ اللہ ہی کے گھر جاؤں گی !

چودھری صاحب : (ہاتھ لہرا کر) آخر کیوں ؟ میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں۔

اماں :۔ اللہ تمہیں خوش رکھے سو برس جیو۔

چودھری صاحب :۔ تو بیٹے کے گھر جانے میں کیا حرج ہے۔ (بستر کی طرف اشارہ کر کے) یہ گندہ بستر ہے۔ دھوپ نہیں آتی۔ وہاں ہر طرح کا آرام ہوگا۔

اماں :۔ اچھا چلی جاؤں گی۔ کل پرسوں

چودھری صاحب :۔ (اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) واہ اماں آج تو خوش کر دیا ہے تو نے۔ دل باغ باغ ہو گیا ہے۔

(مہراں مسکراتی ہوئی چارپائی کی طرف آتی ہے)

مہراں :۔ بہت اچھی بات ہے اماں۔

چودھری صاحب :۔ ڈولی کا انتظام کئے دیتا ہوں۔ مگر ڈولی کی کیا ضرورت ہے۔ اماں کو بازو
بڑھاتے ہوئے، تو اٹھا کر ہی لے جاؤں گا! (اماں سے مخاطب ہو کر) اچھا اماں! اب
تو آرام کر۔ مہراں۔
(اماں کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں)

مہراں :۔ چودھری صاب جی!

چودھری صاحب :۔ کسی کو مت آنے دو۔ شور میں مریض کو آرام نہیں ملتا سمجھ لیا نا۔
(مہراں اثبات میں سر ہلاتی ہے چودھری صاحب اٹھتے ہیں)
شام سے پہلے ایک دو بار چکر لگا جاؤں گا (اماں پر جھک کر، اماں! کوئی چیز چاہیئے۔
(اماں آنکھیں بند کئے نفی میں سر ہلاتی ہے)
کچھ نہیں چاہیئے!۔ اچھا۔ جو جی چاہے گا۔ لے آؤں گا۔ (مہراں سے) سو جائے تو بہتر
ہے۔ بے شک دروازہ بند کر لیا کرو۔
(چودھری صاحب باہر جانے لگتے ہیں۔ اماں آنکھیں کھولتی ہے)

اماں :۔ سدا سکھی رہو۔ عزت آبرو زیادہ ہو۔
(چودھری صاحب دروازے میں سے نکل جاتے ہیں)

مہراں :۔ دیکھا اماں! رات کی دعاؤں کا اثر
(اماں اثبات میں سر ہلاتی ہے اور اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیتی ہے)
اماں!

اماں :۔ ہوں (لہجے میں غنودگی سی) کیا ہے۔ مہراں!

مہراں :۔ کیوں نیند آ رہی ہے؟
(اماں اثبات میں سر ہلاتی ہے)
تو میں ذرا اچھے کی خبر لے آؤں۔ پتہ نہیں زہرا نے کھچڑی اتاری ہے یا نہیں!

(اماں بدستور آنکھیں بند کئے سر کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہتی ہے۔ مہراں چلی جاتی ہے۔

اماں کی آنکھیں بند ہیں۔ سٹیج پر کوئی نہیں آتا۔ تین چار لمحے گزر جاتے ہیں۔ یکایک سرہانے پر لالو ماشکی آتا ہے۔ خالی مشک ابھی تک اس کی پشت پر ہے۔ دروازے پر ایک لمحے کے لیے رک کر وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ۔ اماں کی طرف بڑھتا ہے جھک کر اس کا چہرہ دیکھتا ہے۔ پھر تیزی سے لحاف میں ہاتھ ڈالتا ہے۔

اس کے ہاتھ باہر آتے ہیں۔ تو ان میں ایک صندوقچہ ہے۔ لالو دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ یکایک دروازے پر حسن آجاتا ہے۔ لالو کو دیکھتا ہے ، اور تیزی سے اس کی طرف بڑھتا ہے۔

حسن :- چور بدمعاش۔

حسن تان کر ایک گھونسہ لالو کو مارتا ہے ۔ شور کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اماں جاگ اٹھتی ہے ۔ اور پردہ گرتا ہے۔

دوسرا منظر

ایک منٹ کے بعد دوسرے منظر کا پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج اسی کوٹھڑی کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ جسے ہم پہلے منظر میں دیکھ چکے ہیں۔ اماں چارپائی پر بیٹھی ہے۔ اس سے کچھ دور چارپائی پر وہی صندوقچہ پڑا ہے جسے لالو ماشکی چرا کر لے جا رہا تھا۔ اور جسے حسن نے دیکھ لیا تھا۔ زمین پر دودھ کا پیالہ اور لحاف پر تھیلا ہے۔ اماں کے اردگرد چودھری صاحب، مولوی جی، حسن اور اسلم کھڑے ہیں۔ ان کے علاوہ شیداں اور مرادو بھی ہیں۔ شیداں بار بار دوپٹے کے دامن سے ناک اور آنکھیں صاف کر رہی ہے ۔ شیداں کے پاس لالو ماشکی اس انداز میں کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے مجرم ہے ۔

دروازے کے قریب مہراں سر جھکائے کھڑی ہے۔

جیسے ہی پردہ اٹھتا ہے، چودھری صاحب لالو ماشکی پر برستے ہوئے نظر آتے ہیں

چودھری صاحب :۔ بدمعاش، پاجی کتے! تجھے شرم نہ آئی مسکین بڑھیا کی پونجی چراتے ہوئے۔

مولوی صاحب :۔ استغفراللہ! کتنی ذلیل حرکت ہے۔ یہی آثار ہیں قیامت کے۔

مرادو :۔ (آہ بھر کر) قیامت آگئی ہے مولوی جی!

چودھری صاحب :۔ بولتے کیوں نہیں! (کڑک کر) خبیث! خاموش کیوں کھڑے ہو؟

(چودھری صاحب غصے کی شدت میں لالو کی طرف بڑھتے ہیں۔ لالو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ شیداں جلدی سے شوہر کے آگے آجاتی ہے۔ چودھری صاحب رک جاتے ہیں)۔

حسن :۔ اگر ایک سکینڈ نہ آتا تو لے جاچکا تھا حرامی

مرادو :۔ توبہ توبہ کیا زمانہ آیا ہے (شیداں سے) ذرا اس بی بی رانی کو تو دیکھو۔ اماں کے لیے سیب اور کیلے لائی تھی۔ (سر ہلاتے ہوئے) یہ خبر نہیں تھی۔ میاں بیوی کی کچھ اور ہی نیت ہے۔

شیداں :۔ (تنک کر) تم چپ کر کے بیٹھو جی۔ میں سب کو جانتی ہوں۔ حتو نے مشہور کر دیا۔ اماں کے پاس روپیہ ہے اور — سب بھاگے آئے۔

مرادو :۔ (جلدی سے چودھری صاحب کو مخاطب کر کے) سنا چودھری صاحب! کہتی ہے میں سب کو جانتی ہوں۔ مطلب یہ کہ چور اس کا خصم نہیں ہم ہیں۔

چودھری صاحب : یہ تو تھانے جا کر ہی معلوم ہوگا کہ کون چور ہے۔

اسلم :۔ تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے جی! ایک منٹ میں تختہ کر کے رکھ دوں گا۔

مولوی صاحب :۔ خدا ہی رحم کرے ہماری حالت پر (لمبی آہ بھر کر) دن دہاڑے

یہ ظلم! (لالو سے) نامعقول کیا منہ دکھائے گا خدا کو۔ دنیا میں بھی منہ کالا، آخرت میں بھی کالا۔

لالو :۔ میں نے کیا کیا ہے!

اسلم :۔ چودھری صاحب! بتاؤں اس نے کیا کیا ہے۔ (لالو سے) چل ذرا باہر۔ (اسلم کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

چودھری صاحب :۔ (اسلم کو لالو سے علیحدہ کرتے ہوئے) تم کیوں قانون اپنے ہاتھ میں لیتے ہو۔ قانون جانے اور اس کا مجرم۔

حسن :۔ تو لے چلیں تھانے میں (لالو کی طرف بڑھتے ہوئے) چلو سرکار تشریف کا ٹوکرا لے چلو!

شیداں :۔ اللہ کے واسطے ٹھہر جاؤ۔

(شیداں لالو کے سامنے آجاتی ہے)

حسن : ماسی میں کہتا ہوں تو پیچھے ہٹ جا۔

شیداں :۔ پہلے ذرا اپنے گریبان میں بھی منہ ڈالو۔ تم سب کیا کرنے آئے تھے پہلے کبھی اماں۔

چودھری صاحب :۔ (گرج کر) شیداں! بکواس بند کر پیچھے ہٹ جا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ (اسلم سے) لے جاؤ (لالو کو پاؤں مار کر) اس پاجی کو۔

(اسلم لالو کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ شیداں اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے "اللہ کا واسطہ ٹھہر جاؤ" کہتی ہے۔)

حسن :۔ بالکل نہیں۔

مولوی صاحب :۔ خدا کا یہی حکم ہے۔

(جیراں دہیں دروازے کے پاس چپ چاپ کھڑی رہتی ہے اور اماں

کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھتی رہتی ہے۔ اس ہنگامے میں وہ اپنے
دونوں ہاتھ بلند کرتی ہے)

اماں:۔ ٹھہرو۔

(ہنگامہ ختم جاتا ہے۔ سب اماں کو دیکھنے لگتے ہیں)

کچھ اس بڑھیا کی بھی سنو!

چودھری صاحب:۔ کیوں اماں!

اماں:۔ لڑتے کیوں ہو۔ ماں کا سب کچھ اپنے بچوں کے لئے ہی تو ہوتا ہے۔ میری پونجی
تمہارے ہی لئے ہے۔ تمہیں نہیں دوں گی تو کیا قبر میں ساتھ لے جاؤں گی؟۔
مہراں

مہراں:۔ ہاں اماں!

اماں:۔ میرے پاس رکھ دے۔ (اماں صندوقچے کی طرف اشارہ کرتی ہے)

(مہراں صندوقچہ اٹھا کر اماں کے پاس رکھ دیتی ہے۔ اماں صندوقچہ کھولنے
لگتی ہے۔ سب ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھ رہے ہیں۔ صندوقچہ کھلتا ہے تو
اس میں کفن نظر آتا ہے۔

اماں کفن باہر نکالتی ہے۔ اور ہاتھ کے اشارے سے سب کو قریب بلاتی ہے)

حسن:۔ کفن!

اماں:۔ یہ تو میرا خزانہ۔ یہی میرا سب کچھ ہے۔ پیسہ پیسہ جوڑ کر بنایا تھا۔ تاکہ میرا مردہ
یہیں نہ پڑا رہے۔ لے لو۔ میرا خزانہ۔ میری ساری پونجی۔ بانٹ لو آپس میں۔

(سب وہیں کھڑے رہتے ہیں اماں زور سے کھانستی ہے)

لیتے کیوں نہیں — میں اپنا خزانہ دے رہی ہوں — سارے کا سارا خزانہ
دے رہی ہوں — اور کونسی دولت ہے میرے پاس۔ آؤ نا۔ رک کیوں گئے؟

ہو — لیتے کیوں نہیں — مجھے کیوں تک رہے ہو — اب لیتے کیوں نہیں —
میں پوچھتی ہوں لیتے کیوں نہیں ہو — سوچ کیا رہے ہو — آؤ نا —

(زور سے کھانستی ہے)

اپنا سب کچھ دے رہی ہو — سب کچھ دے رہی ہوں — لے لو —

(اماں کفن ان کی طرف پھینکتی ہے اور پھینکتے ہوئے چارپائی سے نیچے گر پڑتی ہے)

(مہراں دوڑ کر اس کی طرف بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پردہ گرتا ہے)

اپنا اپنا راگ

کردار

بیگم غیاث

طلعت

نزہت

جلیل

جیواں

منظر:۔ ایک ڈرائنگ روم جیسا کہ متوسط گھرانوں میں ہوتا ہے۔ نہ تو زیادہ قیمتی اور اعلیٰ
درجے کے سامانِ آرائش سے مزین اور نہ اس قدر سادہ کہ عام کمروں اور
ڈرائنگ روم میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے ۔ دروازہ مغربی دیوار میں۔
دو تپائیاں اور ایک صوفہ سیٹ، ان کے علاوہ ایک چھوٹی گول میز جس کے اوپر
ایک درمیانے درجے کا سیٹ۔
سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک سنگار میز۔ مشرقی دیوار کے ساتھ ایک پلنگ۔
وقت: دن کا تیسرا پہر شروع ہو چکا ہے۔
جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ بیگم غیاث مشرقی دیوار کے پاس پلنگ پر بیٹھی پان
بنانے میں مصروف نظر آتی ہے۔ پاندان تپائی کے اوپر رکھا ہوا ہے۔
بیگم غیاث کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اچھی خاصی فربہ اندام عورت
ہے۔ رنگ سانولا۔ آنکھیں جسم کے مقابلے میں ذرا چھوٹی۔
بیگم کو جلدی جلدی بات کرنے کی عادت ہے۔ اس بات کا احساس نہیں کرتی
کہ کوئی اس کی بات سمجھ بھی رہا ہے یا نہیں۔ چونکہ موٹی ہے۔ اس لئے جب
زیادہ باتیں کرتی ہے تو اس کا سانس عموماً پھول جاتا ہے۔
پان پر کتھا لگاتے وقت وہ نظر اٹھا کر مغربی دروازے کی جانب دیکھتی ہے۔
دروازے پہ کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ ہاتھ کو یوں جھٹکا دیتی ہے۔ جیسے کسی کا

انتظار کرتے کرتے اب بیزار سی ہو گئی ہے۔ منہ میں ڈالنے کیلئے پان لپیٹ رہی ہے کہ دروازے پر جلیل آتا ہے

جلیل ایک خوش وضع نوجوان ہے۔ خوبصورت تو نہیں مگر بدصورت بھی نہیں۔ اس کے چہرے کی شگفتگی اسے دلکش بنائے رکھتی ہے۔ بیگم پان منہ میں رکھ لیتی ہے۔ ابھی اس کی نظر دروازے پر نہیں پڑی۔ جلیل ایک لحظے کے لئے ٹھٹکتا ہے۔ پھر آگے بڑھنے لگتا ہے۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر رُک جاتا ہے۔

بیگم غیاث کو اچانک کسی کی آمد کا احساس ہوتا ہے۔ جلیل کی طرف دیکھتی ہے اور اُس کے چہرے کا تاثر واضح طور پر بتاتا ہے کہ جلیل کے آنے کی اُسے کوئی خوشی نہیں ہے۔ رسماً مسکرانے ہی پر اکتفا کرتی ہے۔

جلیل مؤدبانہ طور پر آگے بڑھتا ہے۔

بیگم سر کے اشارے اُسے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہتی ہے۔

جلیل کرسی کے قریب پہنچ کر بڑے ادب سے آداب عرض کرتا ہے۔ بیگم مسکراتے ہوئے سر ہلاتی ہے گویا سلام کا جواب دے رہی ہے۔

جلیل کرسی پر ابھی تک بیٹھا نہیں ہے۔ شاید اس بات کا انتظار کر رہا ہے کہ بیگم خاص طور پر بیٹھنے کے لئے کہے تو وہ بیٹھ جائے۔ بیگم پان چبا رہی ہے، اس لئے کچھ کہنے کے لئے چند لمحوں کی ضرورت ہے۔ جلیل اس بات کا احساس کر چکا ہے۔ اس لئے وہ خاموش رہتا ہے۔

بیگم پیک دان اٹھاتی ہے۔ اس میں پیک یوں پھینکتی ہے کہ ہونٹوں کے دونوں کناروں پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں۔ جلیل یہ سمجھ کر کہ اب سلسلۂ گفتگو شروع ہونے والا ہے ذرا جھک جاتا ہے۔

بیگم اُس کی طرف دیکھتی ہے اور مشینی انداز میں سر ہلاتی ہے۔

جلیل ذرا اور قریب ہو جاتا ہے۔

بیگم غیاث :۔ تو جلیل بیٹا آیا ہے۔

جلیل :۔ (ادب سے) جی !۔ چچی جان !

بیگم غیاث : بہت مدت کے بعد دیکھا ہے کہاں چلے گئے تھے ؟

جلیل :۔ مصروف رہا چچی جان !

بیگم غیاث :۔ اوہو۔ ابھی تک کھڑے ہو۔ بیٹھ جاؤ نا !

جلیل :۔ شکریہ چچی جان !

(جلیل کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

بیگم غیاث :۔ کیا کہا ۔ ؟

جلیل :۔ جی عرض کیا ہے۔ مصروف رہا چچی جان ــــــ اور تو کوئی بات نہیں تھی !

بیگم غیاث :۔ ہوں ــ اچھا اچھا۔ ماشا اللہ۔ پڑھائی کرتے ہو نا۔

جلیل :۔ پڑھائی تو ختم ہو چکی ۔ چچی جان !

(بیگم غیاث پھر اسی انداز میں پیک پیک دان میں گراتی ہے۔ اس کارروائی کے دوران خاموشی رہتی ہے)

بیگم غیاث :۔ ہاں تو (بھول گئی ہے کہ بات کیا ہو رہی تھی)۔ سمجھی۔

خلیل :۔ آج کل پریکٹس کر رہا ہوں۔

بیگم غیاث :۔ کیا کرتے ہو ؟

جلیل :۔ ڈاکٹری۔

بیگم غیاث :۔ یعنی کہ ـــ ڈاکٹر بن گئے ہو ! ہیں ؟

جلیل :۔ آپ کی دعا برکت ہے۔

(جلیل ہنس پڑتا ہے۔ بیگم غیاث کو یہ ہنسی پسند نہیں آتی۔ ماتھے پر شکنیں سی نمایاں ہو جاتی ہیں)

اچھا تو ڈاکٹر ہو گئے ہو نا۔ یہی تو میں کہتی ہوں۔ ماشاء اللہ۔ کیا بات ہے۔ ڈاکٹر لوگ تو خوب کما لیتے ہیں۔ میری خالہ کی جٹھانی کی بڑی بہن بیمار ہو گئی تو۔ ڈاکٹروں نے خوب خوب ہاتھ رنگے۔ ہر روز فیس۔ پورے چالیس روپے توبہ۔ توبہ۔ مگر بیٹا! ڈاکٹر ڈاکٹر میں فرق ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا۔ کیوں نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ خدا نے پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں۔

(بیگم غیاث سینے پہ ہاتھ رکھ لیتی ہے)

جلیل :۔ آپ نے درست فرمایا!

(بیگم غیاث ابھی بات کرنے کے قابل نہیں ہوئی)

بالکل بجا فرمایا۔ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد۔

بیگم غیاث :۔ ہوں، پان کھاؤ گے۔ کھاؤ گے نا!

(پاندان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)

مگر ڈاکٹر لوگ پان کھاتے ہی کب ہیں؟

(مسکرا کر ہاتھ کھینچ لیتی ہے)

یہ چیز تو ہم غریبوں کے لئے ہے!۔ بیٹھے جگالی کرتے رہتے ہیں۔ اور کیا؟

جلیل :۔ نہیں چچی جان جگالی کیا ہوئی۔ خوش ذوقی ہے پان کھانا۔

بیگم غیاث :۔ ڈاکٹر بن گئے ہو۔ اچھا کیا ہے۔ بیٹا! اور کیوں نہ کرتے۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ لائق فائق ہو نا۔

جلیل :۔ اور۔ ثریا نے کالج جانا چھوڑ دیا ہے کیا؟

(بیگم ایک لمحے کے لئے اسے گھور کر دیکھتی ہے جیسے وہ اس کے منہ سے ایسی بات سننا پسند نہیں کرتی)

بیگم غیاث:۔ ہاں کافی پڑھ لیا ہے۔ لڑکی ذات زیادہ پڑھ لکھ کر کیا کرے گی؛

جلیل:۔ جی۔

بیگم غیاث:۔ شریفوں کی بیٹیاں اسی قدر پڑھتی ہیں۔

جلیل:۔ درست فرمایا چچی جان!

بیگم غیاث:۔ تم کہو جلیل بیٹا۔ ہاں تم تو ڈاکٹر بن گئے ہو۔

(جلیل ٹھوڑی پر دائیں ہاتھ کی انگلی پھیرنے لگتا ہے۔ جیسے کسی کشمکش میں گرفتار ہو)

جلیل:۔ آپ جانتی ہیں چچی جان۔ ماں بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔

بیگم غیاث:۔ اللہ بہشت نصیب کرے۔ بڑی اچھی عورت تھی۔

جلیل:۔ باپ بھی دو سال ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔

بیگم غیاث:۔ اوہو۔ ہمیں تو خبر ہی نہیں ملی۔ اطلاع تو دی ہوتی۔ آج کل کے لڑکے جھٹ غیر بن جاتے ہیں۔ جیسے پرانے لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

جلیل:۔ کیا کہوں چچی جان! پریشانی میں کچھ بھی تو نہ سوچ سکا۔

بیگم غیاث:۔ ماں باپ سدا ساتھ نہیں رہتے۔ (آہ بھر کر) رہے نام اللہ کا

جلیل:۔ سر پہ بزرگوں کا سایہ نہ ہو تو کیا ہوتا ہے۔ آپ جانتی ہیں چچی جان! سب کچھ خود ہی کرنا پڑتا ہے اور کون کرتا ہے چچی جان!

بیگم غیاث:۔ کیوں۔ خدانخواستہ

جلیل:۔ شرم آتی ہے پر۔ دیکھئے نا چچی جان!

بیگم غیاث:۔ کہہ جو دیا فکر نہ کرو

جلیل:۔ میرا مطلب ہے چچی جان!

بیگم غیاث :- کہہ جو دیا فکر نہ کرو۔ ڈاکٹری واکٹری نہیں چلتی تو نہ سہی۔ اللہ مالک ہے۔

(دروازے پر رقیہ آتی ہے۔ بہن سے دو تین سال چھوٹی۔ مگر موٹاپے میں قریباً برابر۔ بیگم غیاث کی ادھر نگاہ جاتی ہے۔ فوراً کھل اٹھتی ہے)

آگئیں خیر سے۔ بڑی جلدی آگئی ہو۔ دونوں جہان کے کام آج ہی آپڑے ہوں گے۔

رقیہ :- کیا کہوں آپا۔

بیگم غیاث :- کہو گی کیا ؟-

رقیہ : آتو گئی ہوں نا !

(بیگم غیاث جلیل کو فراموش کر چکی ہے اور رقیہ نے اسے سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ اور نظر انداز کر دیا ہے۔

جلیل :- سلام علیکم چچی !

(رقیہ رسمی طور پر ذرا مسکرا کر سر ہلاتی ہے۔ اور کن آنکھیوں سے بہن کو دیکھتی جاتی ہے)

بیگم غیاث :- یہ اپنا جلیل ہے !

رقیہ :- اچھا — اچھا — اچھے ہو نا بیٹا ! بڑی مدت بعد دیکھا۔ خیر خیریت تو ہے نا !

جلیل :- جی ہاں۔

رقیہ :- میں بھی سوچتی تھی یہ اپنا جلیل ہی تو ہے اور کون ہو سکتا ہے ؟

جلیل :- شکریہ چچی !

بیگم غیاث :- چل بیٹا ! تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔ تمہارے چچا آنے ہی والے

ہیں۔ اُن سے کہوں گی۔ ہو جائے گا بندوبست انشاء اللہ۔ چائے پیو گے ۔
پیو گے نا ۔ آخر کیوں نہیں پیئو گے ؟
جلیل :۔ جی نہیں شکریہ !
بیگم غیاث :۔ کیوں نہیں پیو گے ۔ تمہارا اپنا گھر ہے ۔
جلیل :۔ شکریہ چچی جان ! پی کر ہی آیا تھا ۔
بیگم غیاث :۔ بڑا تکلف کرتے ہو ۔ خواہ مخواہ ۔ اچھی بات نہیں ہے ۔ (بہن
کی طرف مڑتی ہے) تو رقیہ !
(جلیل کچھ کہنے ہی والا ہے کہ بیگم غیاث کو بہن سے مخاطب ہوتے ہوئے
دیکھ کر اُٹھ بیٹھتا ہے ۔ اور جانے لگتا ہے ۔
رقیہ اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے)
اچھا تو کیا خبریں ہیں ۔
رقیہ :۔ میں نے کہا آپا ۔ یہ ہے کون ؟
بیگم غیاث :۔ کون ہو گا ۔ وہی جلیل ۔ سبحان اللہ ! تم تو اُسے (مسکرا کر) اپنا
جلیل بتا رہی تھیں !
رقیہ :۔ وہ تو آپا ۔ کیا کہتی اور سنتی ہے ، یہی تو دنیا داری ہے !
بیگم غیاث :۔ وہی لونڈا ہے نا ۔ بابو اللہ داد کا بیٹا ۔ عائشہ ۔ کو بھول گئی
ہو گیا ۔ اسی کا تو بیٹا ہے ۔
(رقیہ جلیل والی کرسی میں بیٹھ جاتی ہے)
رقیہ :۔ اچھا ، اچھا جوان ہو گیا ہے ۔ آیا کیوں ہے ؟
بیگم غیاث :۔ ڈاکٹری کر لی ہے ۔ پر چلتی نہیں ۔ آیا ہے ثریا کے ابا سے کہنے سننے
نوکری دوکری کے لئے (بات کا رخ بدل کر) تو پھر ۔

رقیہ :۔ میٹھ تو لینے دو۔

بیگم غیاث :۔ کیا اب لیٹنے کا ارادہ ہے ؟

رقیہ :۔ نہیں آپا — دھنتی ہے اتم بھی تو کمال کر دیتی ہو — اچھا آپا ! اسپچی بات یہ ہے کہ پہلے تازہ تازہ مٹھائی منگواؤ۔

بیگم غیاث :۔ مٹھائی بھی آجائے گی ۔کہو تو کچھ۔

رقیہ :۔ اپنی ثریا کے لئے وہ رشتہ ڈھونڈا ہے کہ تڑپ ہی جاؤ گی سُن کر

بیگم غیاث :۔ تڑپا دُ تو — دیکھتی کیا ہو ؟

رقیہ :۔ پہلے وہ

بیگم غیاث :۔ بچی کیوں بن گئی ہو — آجائے گی پیچی بھی

(بیگم غیاث ہنس پڑتی ہے ۔رقیہ بھی اس کی شریکِ حال ہو جاتی ہے)

رقیہ :۔ آپا !

(ہنسی کی وجہ سے بیگم غیاث کچھ کہتی نہیں)

اب مٹھائی آئے گی تو کہوں گی ۔ کیا یاد کرو گی تم بھی آپا !

بیگم غیاث :۔ جیواں آتی ہے تو منگوا لیتی ہوں ۔

رقیہ :۔ اور گھر میں نہیں ہے کوئی۔

بیگم غیاث :۔ ثریا ہے اور کون ہو گا ۔

(جیواں آتی ہے)

رقیہ :۔ لو آگئی جیواں !

بیگم غیاث :۔ جیواں ! ثریا سے پیسے لے کر مٹھائی لے آؤ۔ مری جا رہی ہے یہ بھو کی ندیدی ۔ (جیواں مسکراتی ہے)

جیواں :۔ اچھا اچھا — مبارک ہو بی بی

بیگم غیاث: ابھی تو کچھ بتایا ہی نہیں — شرطیں منوا رہی ہے خیر سے۔

جیواں:۔ اللہ نیک نصیب کرے۔

(جیواں کمرے سے نکل جاتی ہے)

بیگم غیاث:۔ اب تو بتاؤ نا۔

رقیہ:۔ آپا — لڑکا کنوارا ہے۔

بیگم غیاث:۔ کنوارا ہے — تو کیا میں اپنی ثریا کسی رنڈوے کو دوں گی — کیسی باتیں کرتی ہو؟

رقیہ:۔ بات تو سن لیتیں پوری — بڑا نیک اطوار — شریف طبع — برسرِ روزگار — جنگلات کے محکمے میں کام کرتا ہے۔

بیگم غیاث:۔ نام کیا ہے؟

رقیہ:۔ محمد یعقوب خاں — پٹھانوں کی اعلیٰ نسل سے ہے۔

بیگم غیاث:۔ محمد یاقوب — محمد یا — قوب

(پیشانی پر اس طرح انگلیاں پھیرتی ہے۔ جیسے کچھ یاد کر رہی ہے)

وہی تو نہیں جس کے دو بھائی بائیسکوپ میں کام کرتے ہیں

رقیہ: بائیسکوپ میں کام کرتے ہیں تو کیا ہوا۔ وہ خود تو سرکاری ملازم ہے نا۔ پانچ سو تنخواہ ہے۔ اوپر سے آمدنی بڑی معقول ہو جاتی ہے۔

بیگم غیاث: کل پانچ سو۔

رقیہ:۔ اوپر کی آمدنی بھی تو خاصی ہے آپا! مل ملا کر سات آٹھ سو ہو جاتی ہے اور کیا؟

(رقیہ بہن کو خاص نظروں سے دیکھتی ہے)

آپا! تم تو بس یونہی ہو — سمجھا بجھی کرو کچھ — اللہ کا بڑا افضل ہے آپا

بتاؤ تو اس سے اچھا رشتہ اور کہاں ملے گا بھلا ؟

بیگم غیاث :۔ درست کہتی ہو !

رقیہ :۔ میں کہتی ہوں بڑا ہی اچھا رشتہ ہے۔

بیگم غیاث :۔ نزہت اور طلعت بھی آرہی ہیں۔

رقیہ :۔ وہ کیا لائیں گی۔ رشتہ ؟

بیگم غیاث ۔ سننے میں حرج کیا ہے۔ آخر ؟

رقیہ :۔ بڑ آپا ! کہے دیتی ہوں۔ اس سے بہتر رشتہ ملے گا نہیں کہیں۔ دیکھ لینا

(باہر سے طلعت کی آواز آتی ہے)

طلعت :۔ آپا !

بیگم غیاث :۔ طلعت تو آگئی ہے (بلند آواز سے) آؤ طلعت !

(طلعت آتی ہے۔ سن چالیس سے کم۔ درمیانہ قد و قامت نہ موٹی اور نہ پتلی)

طلعت :۔ واہ وا ! یہاں تو بڑے بڑے لوگ آئے بیٹھے ہیں۔

رقیہ :۔ تم بھی تو کم بڑی نہیں ہو۔

طلعت :۔ ہم کیا بڑے ہوں گے۔ (بیگم غیاث سے) کہو آپا۔ خیریت تو ہے نا۔

بیگم غیاث :۔ کچھ بتاؤ گی تو خیریت ہو گی نا۔

طلعت :۔ سمجھو بات طے کر لی ہے میں نے

بیگم غیاث :۔ بات بھی طے کر لی ؟

طلعت :۔ ایسا بر ڈھونڈا ہے کہ — اب کیا کہوں۔ سنو گی تو کہو گی۔ شاباش ہے تم پر طلعت — خوش کر دیا ہے تم نے !

(جیواں مٹھائی لے کر آتی ہے)

واہ واکیا ہی اچھے موقعے پر مٹھائی آئی ہے۔

(رقیہ کے چہرے کے اثرات بتا رہے ہیں کہ وہ جل رہی ہے۔ ماتھا شکن آلود ہو گیا ہے)

میرے لئے ہی منگوائی ہے نا۔

بیگم غیاث:۔ تمہارے لئے کیوں۔ سب کے لئے ہے۔

(جیوان دو پلیٹوں میں مٹھائی ڈالتی ہے۔ طلعت ایک لڈو اٹھا کر منہ میں ڈال لیتی ہے۔ رقیہ بیگم غیاث کو دیکھ کر یوں منہ بناتی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو کیسی ندیدی عورت ہے)

لو رقیہ!

رقیہ:۔ ذرا ان سے کچھ سن تو لیں

طلعت:۔ (دوسرا لڈو اٹھاتی ہے) آپا—

(منہ میں لڈو ہے بات نہیں کر سکتی)

بیگم غیاث (رقیہ سے) کھاؤ نا۔

رقیہ:۔ کھا لیتی ہوں۔ مٹھائی بھلا کہاں بھاگ جائے گی؟

بیگم غیاث:۔ (مسکرا کر) یہ تو نہ کہو— جس رفتار سے بھاگ رہی ہے۔ منٹوں ہی میں غائب ہو سکتی ہے۔

طلعت:۔ اچھا آپا۔ اور کچھ کہہ لو۔ ہم تو بھوکے ہیں نا۔

(طلعت گلاب جامن اٹھانے لگتی ہے، مگر پھر چھوڑ دیتی ہے۔

بیگم غیاث:۔ نہ نہ بابا— تم کیوں بھوکی ہو گی۔

طلعت:۔ تو آپا! میں کہہ رہی تھی۔ ثریا جیسی تمہاری بیٹی ہے ویسی میری ہے۔

بیگم غیاث:۔ کیوں نہ ہو آخر پھوپھی ہو۔

طلعت:۔ وہ تم جانتی ہو۔ نور دین انجنیئر کو— اس کا منجھلا صاحبزادہ۔

رقیہ :۔ سبحان اللہ۔

(رقیہ ایک ہی بار برفی کے دو ٹکڑے اٹھا لیتی ہے)

طلعت :۔ (سنجیدگی سے) کیا مطلب ؟

بیگم غیاث :۔ اچھا رشتہ ہے — مہربانی تمہاری۔

رقیہ :۔ اپنی طرف سے کوشش تو بہت کی ہے مگر — خیر۔

طلعت :۔ اچھا اب بھی — بی رقیہ بانو بھی رشتہ لائی ہیں — ماشاء اللہ
چشم بد دور۔

رقیہ :۔ رشتہ لائی ہوں اور ایسا لائی ہوں کہ تمہارے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا۔

طلعت :۔ آپا! ذرا انہیں سمجھائیں۔ دنیا میں صرف کنواں ہی نہیں سمندر بھی ہوتا
ہے!

رقیہ :۔ بڑی آئی ہیں باتیں بنانے والی۔ کنوئیں کی مینڈک تم ہوگی — سوچ سمجھ کر بات کرو۔
ہمیں بھی جواب دینا آتا ہے۔ صاف صاف کہے دیتی ہوں۔

طلعت :۔ لو آپا۔ اور سنو۔ تم نے کہا ثریا کے لیے بر ڈھونڈو۔ ڈھونڈ کے لائی ہوں
تو اب باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ طعنے دیے جا رہے ہیں — یہ ہے نیکی کا بدلہ
آج کے زمانے میں۔

بیگم غیاث :۔ کون باتیں بناتا ہے — چھوڑو نا اس قصے کو۔ دونوں اچھے رشتے ہیں پر
ابھی صبر سے کام لینا چاہیے۔

طلعت :۔ انہوں نے تو لڑنا ہی شروع کر دیا ہے خواہ مخواہ۔

رقیہ :۔ لڑتی میں ہوں یا تم ؟

طلعت :۔ سچ کہنا آپا۔ لڑتا کون ہے ؟

بیگم غیاث :۔ کوئی بھی نہیں لڑتا بابا! — کوئی بھی نہیں لڑتا — لڑنے کی ضرورت

(اختر آتی ہے۔ ثریا کی بڑی بہن)

اختر: ہیں۔ یہاں تو پھوپھی بھی ہیں اور خالہ بھی۔ آداب عرض

(طلعت اور رقیہ دونوں سر ہلا دیتی ہیں)

ضرور کوئی خاص بحث ہو رہی ہے۔ مسئلہ زیرِ بحث کیا ہے۔ میں بھی تو سُنوں

(سب خاموش رہتے ہیں)

کیا، ایوان نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا

(مٹھائی دیکھتی ہے)

کیا بات ہے۔ مٹھائی بھی آ چکی ہے ۔ اگر خدانخواستہ کوئی تلخی پیدا ہو گئی ہے تو مٹھائی موجود ہے۔ منہ کا مزہ بدلا جا سکتا ہے۔

بیگم غیاث:۔ (ذرا غصے سے) اختر؟

اختر:۔ جی اماں!

بیگم غیاث:۔ تمہیں کئی دن ہوئے بلایا تھا — اتنے روز کہاں رہی ہو؟

اختر:۔ ان کی طبیعت کچھ خراب تھی اماں!

بیگم غیاث:۔ ہیں ہیں طبیعت خراب تھی۔ اب کیسی ہے؟

اختر:۔ ٹھیک ہے اب تو۔

بیگم غیاث:۔ تمہاری بہن کے لئے بڑی پریشان ہوں۔ رشتے کے لئے کئی لوگوں سے کہہ چکی ہوں۔ پر بَر ملتا ہی نہیں۔

رقیہ:۔ کیا کہا آپا بَر نہیں ملتا؟

طلعت:۔ تمہاری ثریا کے لئے فرشتے ڈھونڈیں گے بَر۔ ہم سے تو نہیں ہوتا یہ کام۔

اختر:۔ خالہ اور پھوپھی رشتہ لائی ہوں گی۔

بیگم غیاث:۔ بڑی مہربانی ہے ان کی۔

اختر:۔ اور اب ایوان میں بحث یہ ہو رہی گی کہ کس کا رشتہ بہتر ہے۔ خالہ کا کہ پھوپھی کا

بیگم غیاث :۔ ویسے رشتے دونوں اچھے ہیں !

اختر :۔ تو اماں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ بڑی جلدی معاملہ طے ہو جاتا ہے۔

بیگم غیاث :۔ کیسے ؟

اختر :۔ ایسے نازک وقت میں لوگ عموماً ٹاس کیا کرتے ہیں جھٹ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

بیگم غیاث :۔ شرم کرو اختر !

اختر :۔ اماں ! اور کس طرح یہ مسئلہ حل ہو گا۔ پھوپھی کا کہا مانا تو خالہ ناراض اور خالہ کی بات مانو تو پھوپھی خفا کس کو خفا کیا جائے اور کس کو خوش ؟ اس الجھن کا حل اور کیا ہو گا ؟

(نزہت آتی ہے۔ عمر تیس سے کچھ اُوپر۔ چھریرے بدن کی عورت ـــ اختر اسے دیکھتی ہے)

آداب عرض پھوپھی جان

نزہت :۔ جیتی رہو !

(نزہت کرسی پہ بیٹھتے ہی اندازہ کر لیتی ہے کہ صورتِ حال نازک ہے)

کیا معاملہ ہے ؟

بیگم غیاث :۔ ثریا کے بر کی بات ہو رہی ہے۔

نزہت :۔ بر کی بات ہو رہی ہے۔

بیگم غیاث :۔ ہاں !

نزہت :۔ آپا !

بیگم غیاث :۔ کیا ہے ؟ کہو تم بھی۔

نزہت :۔ آپا ! ایسا بر ڈھونڈا ہے کہ ابھی سینے سے لگا لو گی۔

اختر :- ضرور لگالیں گی۔ اماں یہی منصوبہ بنا رہی تھیں۔

بیگم غیاث :- اختر ! تمیز سے بیٹھ نہیں سکتیں تو دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔

اختر :- ادھر ہی سے تو آرہی ہوں اماں۔

بیگم غیاث :- تو خاموش بیٹھو ! اچھا نزہت !

نزہت :- چینوٹ والے لاکھ پتی احمد دین ہیں نا۔

رقیہ :- وہی چمڑے والے۔

(رقیہ ناک بھوں چڑھاتی ہے)

نزہت :- چمڑے کا کاروبار ہے۔ خود تو نہیں چمڑا بن گئے۔

طلعت :- نزہت ! لڑکے کی عمر کیا ہوگی ؟

نزہت :- عمر ذرا بڑی ہے باجی۔ مگر کوئی اتنی بڑی بھی نہیں۔ ایسے رشتے ہوتے ہی رہتے ہیں۔

بیگم غیاث :- پھر بھی کتنی ہوگی ؟

طلعت :- یہی کوئی بینتالیس پچاس کے درمیان ہوگی۔ زیادہ نہیں ہے۔

بیگم غیاث :- اور میری ثریا تو ابھی پورے بائیس برس کی بھی نہیں ہوئی۔

نزہت :- تو یہ رشتہ پسند نہیں ہے ؟

بیگم غیاث :- ناپسند تو نہیں ہے۔ پر لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔

طلعت :- لڑکا۔ آپا پچاس برس کی عمر کا بوڑھا بھی لڑکا ہوتا ہے ؟

رقیہ :- تم کیوں ٹانگ اڑاتی ہو اس میں ؟

طلعت :- میں نے تو یونہی بات کہہ دی ہے (کان پکڑ کر) بھول ہوئی بہن ! توبہ استغفار کرتی ہوں۔

رقیہ :- آپا : جاتی ہوں میں تو۔

طلعت :- اور میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گی ؟

نزہت :۔ خواہ مخواہ اتنی دوڑ دھوپ کی ۔ نہ دن دیکھا نہ رات اور یہاں ۔ ہونہہ

(تینوں اُٹھ بیٹھتی ہیں)

بیگم غیاث :۔ ذرا بیٹھو تو سہی ! ہائے خدا ۔

نزہت :۔ کیا ضرورت ہے بیٹھنے کی ؟

رقیہ :۔ اور میں کیوں بیٹھوں گی بھلا ؟

طلعت :۔ لڑکی جاتے اور لڑکی کی ماں ۔ ہم کون ہیں دخل دینے والے ! اتنی محنت سے بر ڈھونڈو اور انعام یہ ملتا ہے ۔ باز آئی ہیں تو ۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتی رہی ۔

(تینوں دروازے کی طرف جانے لگتی ہیں)

بیگم غیاث (اُٹھ کر) سنو تو ۔ تمہیں میری قسم !

(تینوں رُک جاتی ہیں)

اختر :۔ ذرا مٹھائی تو ختم کر لیجئے آپ ہی کے لئے اماں نے منگوائی ہے ۔

طلعت :۔ رکھو مٹھائی اپنے پاس ۔ بھوکی نہیں ہیں ہم ۔

بیگم غیاث :۔ اختر ! تیری زبان بڑی لمبی ہو گئی ہے ۔ شرم کر ۔

(تینوں بڑبڑاتی ہوئی دروازے میں سے نکل جاتی ہیں)

اختر :۔ میں نے تو صرف یہی کہا ہے کہ مٹھائی کھا کر جائیں ۔ منہ کا مزا بدل جائے گا ۔ خفا ہو کر جو جا رہی ہیں ۔ بری بات کیا کہی ہے میں نے آخر ؟

(بیگم غیاث بڑھتے غصے سے بیٹی کو دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے)

اماں ۔ فکر نہ کرو ۔

بیگم غیاث :۔ کیوں فکر نہ کروں ۔ کون فکر کرے گا میری جگہ ۔ تم کرو گی جو سنجیدہ رہنا جانتی ہی نہیں ہو ؟

اختر :۔ اماں جان ! ایک بات بتا دوں نا !

بیگم غیاث:۔ کیا بکتی ہے لڑکی!

اختر:۔ کس کی پسند کا بَر چاہیئے۔ پھوپھی جان کا۔ بڑی خالہ کا یا چھوٹی خالہ کا۔

بیگم غیاث:۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔

اختر:۔ میں پوچھتی ہوں۔ جس کا بر ڈھونڈا جا رہا ہے اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت نہیں ہے؟

بیگم غیاث:۔ کہنا کیا چاہتی ہو!

اختر:۔ اماں! عمر تو ثریا ہی نے بسر کرنی ہے۔ کسی اور نے نہیں۔ اور وہ اپنا شریکِ حیات چُن چکی ہے۔

بیگم غیاث:۔ (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اختر کو دیکھتے ہوئے) کیا؟

(اختر دروازے پر جاتی ہے اور باہر منہ نکال کر آواز دیتی ہے)

اختر:۔ جلیل بھیا آیئے۔ اماں جان بلاتی ہیں۔

(جلیل آتا ہے)

جلیل:۔ (بیگم غیاث کے سامنے اداب سے سر جھکا کر) تو چچی جان۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی بڑا چھوٹا ہے نہیں۔ یہ فرض بھی خود ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔ تو چچی جان۔ جی۔

(بیگم غیاث خاموش ہے۔ اختر مسکرا رہی ہے۔
جلیل گھبرا کر اختر کو دیکھتا ہے۔ جو مسکرا کر آگے بڑھتی ہے)

اختر:۔ کہیئے نا بھیا!

جلیل:۔ جی کہہ تو دیا ہے۔

(بیگم غیاث گھور کر جلیل کو دیکھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پردہ گرتا ہے)

وعدہ

کردار

"الحمرا تھیٹریکل کمپنی" کا مینجر

فہمیدہ

اختر

فہمیدہ کی ماں

ایک مرد

ایک عورت

اور وہ آوازیں جو تماشائیوں کی نمائندگی کرتی ہیں

"الحمرا تھیٹریکل کمپنی" کی سٹیج

کھیل شروع ہی ہونے والا ہے۔ سٹیج کے کنارے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک نیلے رنگ کا پردہ پھیلا ہوا ہے۔ سٹیج سے کچھ دور تماشائی نظر نہیں آتے۔ ان کی آوازیں یا تالیوں کا شور ان کی نمائندگی کا حق ادا کرتا رہتا ہے۔

تماشائیوں کی طرف سے تالیوں کا شور بلند ہوتا ہے۔ پردے کے درمیانی حصّے کو ذرا سی جنبش ہوتی ہے۔ مینجر پردے کے باہر آکر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ پردہ اس کی پشت سے مَس کر رہا ہے۔

شور ختم ہو جاتا ہے۔

مینجر سر کو مودبانہ انداز میں ہلاتا ہے مسکراتا ہے اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پشت کی طرف لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے وہاں اس نے ہاتھ باندھ لیے ہیں۔ بولتا ہے تو لہجے میں تصنع نمایاں ہے

مینجر: لیڈیز اینڈ جنٹلمین!

کمپنی آپ کی تشریف آوری کی تہہ دل سے ممنون ہے (ایک دو لمحوں کے لیے خاموش رہ کر سر جھکاتا ہے) ہم شہر بہ شہر گھوم رہے ہیں اور ہر جگہ تھیٹر کے شیدائیوں نے ہماری بڑی عزت افزائی کی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ سٹیج مر چکی ہے وہ آئیں اور دیکھیں کہ سٹیج مر چکی ہے یا زندہ ہے۔ حاضرین والا تمکین! سٹیج زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

(مینجر جوش میں آکر خود تالیاں بجاتا ہے۔ بعد میں تماشائی بھی شامل ہو جاتے ہیں)

آپ کے شہر میں، ہم اپنا نیا کھیل پیش کر رہے ہیں۔ یہ کھیل آج شام بالکل

پہلی مرتبہ سٹیج ہوگا۔ بالکل پہلی مرتبہ۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! اس کھیل کا مسودہ ہمیں کسی ایسے صاحب نے بھیجا تھا جنہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ اس لیے کمپنی بھی مصنف کا نام بتانے سے قاصر ہے تو لیجئے! کمپنی کا نیا کھیل "وعدہ" شروع ہوتا ہے۔ شکریہ۔ تھینک یو۔ ویری۔ ویری مچ

(مینجر سر جھکا کر چلا جاتا ہے۔ دو تین لمحے تماشائیوں کی تالیوں کی آواز آتی رہتی ہے۔ پھر پردہ اٹھتا ہے۔ سٹیج پر آبادی سے دور ایک ویران مقام نظر آتا ہے۔ ایک طرف ایک بنچ بچھی ہے، جس پر فہمیدہ بیٹھی ہے۔ فہمیدہ کا سن سولہ سترہ سے زیادہ نہیں

لباس میں کوٹ اور شلوار دکھائی دیتے ہیں۔ پاؤں میں سینڈل ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو وہ سٹیج کے اس حصے کو دیکھ رہی ہے۔ جہاں آنے جانے کے لئے راستہ بنا ہوا ہے۔

دو تین لمحے اسی عالم میں گذر جاتے ہیں۔ فہمیدہ بنچ سے اٹھتی ہے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتی ہے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سٹیج کے درمیانی حصے میں پہنچ جاتی ہے۔ ایک لمحہ وہاں رک کر دروازے کی جانب دیکھتی ہے۔ سٹیج کے بیرونی حصے سے سیٹی کی آواز آتی ہے۔

فہمیدہ یوں لمبا سانس لیتی ہے جیسے اس کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ مڑتی ہے اور بنچ سے پشت لگا کر ذرا جھک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اختر آتا ہے۔ ایک خوش وضع اور خوش پوشش نوجوان۔ بڑھیا قسم کے سوٹ میں ملبوس۔ ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی جسے وہ کسی نہ کسی انداز میں ہلاتا رہیگا۔

اختر سٹیج کے درمیان میں پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے۔

اختر:۔ آئم سوساری۔ فہمی!۔

فہمیدہ:۔ پورے ایک گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں جناب کا۔ اور اب آئے ہیں۔

(نقل اتار کر) اٹم سو ساری فہمی! (مسکرا کر) فہمی کو سمجھا کیا ہے حضور نے!

اختر: کیا بتاؤں۔ ہوئی تاخیر تو کچھ ___

فہمیدہ: اختر کے الفاظ کاٹتے ہوئے) میں باعثِ تاخیر نہیں پوچھتی۔ چلو تم آ تو گئے۔ یہی غنیمت ہے۔ ایک گھنٹہ لیٹ ہی!

اختر: معاف کر دیا؟

فہمیدہ: شاید

اختر: شاید! گویا معاف کیا ہے اور نہیں بھی۔ دیکھو فہمی!

فہمیدہ: فرمائیے!

اختر: پہلے معاف کر دو۔

فہمیدہ: اچھا۔

اختر: کیا اچھا

فہمیدہ: معاف کر دیا اور کیا؟

اختر: او تھینک یو۔ بڑی اچھی ہو (آگے بڑھتے ہوئے) بہت ہی اچھی۔ ونڈرفل۔
(اختر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جس طرح فہمیدہ کھڑی ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہیں)

فہمیدہ: اُدہنوں۔ (نفی میں سر ہلاتی ہے)

اختر: کیا؟

فہمیدہ: ہر جرم معافی کے قابل نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا ویسا جرم کرو گے تو معافی نہیں ہو گی۔

اختر: مثلاً کون سا جرم؟

فہمیدہ: وہ تو میں خود بھی نہیں جانتی۔

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں)

اختر: ہوا یہ فہمی ___ میں ادھر آ رہا تھا کہ ابا جی بولے "کل جو سوٹ پہنو گے۔ وہ درزی سے لے آؤ" کرتا کیا۔ سخت مجبوری تھی۔

فہمیدہ: کل نیا سوٹ پہن رہے ہو؟

اختر: جی ہاں۔ کل مابدولت کا نکاح جو ہو رہا ہے۔

فہمیدہ: ہوں

اختر: اور اس لڑکی سے ہو رہا ہے جو میرے دنوں کا آفتاب اور راتوں کا مہتاب ہے۔

فہمیدہ: مبارک باد یں

اختر: شکریہ!

(اختر اس انداز سے ہاتھ پیشانی کی طرف لے جاتا ہے جیسے مشاعرے میں شاعر داد وصول کر رہا ہو)

فہمیدہ: (لہجے میں سنجیدگی) اختر!

اختر: کہو جان من!

فہمیدہ: کل ہمارا نکاح ہو رہا ہے۔ ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔

اختر: ہو جائیں گے، کیا مطلب۔ ہو چکے ہیں

فہمیدہ: میں نے تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔

اختر: جانتا ہوں۔ یہاں ہم نے گھنٹوں بیٹھ کر پیار محبت کی باتیں کی ہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ شادی سے پہلے ایک اور ملاقات ہو جائے۔ بڑا لطف رہے گا۔ تم تو سچ مچ ونڈرفل لڑکی ہو!

فہمیدہ: (لہجے میں بھرپور سنجیدگی) مجھے کچھ کہنا ہے تم سے اختر!

اختر: بندہ سراپا گوش ہے۔

فہمیدہ: اختر!

اختر: ہاں فہمی!

فہمیدہ: کل ہماری زندگی کا سب سے مقدس دن طلوع ہونے والا ہے۔ کل ہم ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اپنے نئے اور انتہائی خوشگوار سفر کا آغاز کرنے والے ہیں۔ ہمیں بلندیوں اور پستیوں سے گزرنا ہو گا۔ گرم گرم و

ہماری راہ میں آئے گی اور نوک دار کانٹے بھی ۔ مگر کوئی تکلیف بھی ہمارے
راستے میں دیوار نہیں بن سکے گی ۔

اختر :۔ بھئی تم تو یک لخت شاعرہ بن گئی ہو ۔ کیا کہنے ہیں ان خوب صورت فقروں کے

فہمیدہ :۔ سنو تو ! ہم اس ارادے سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رہے ہیں کہ اب
انہیں موت ہی جدا کر سکے گی ۔ کیا میں درست کہہ رہی ہوں ؟

اختر : ہاں میری فہمی ۔

فہمیدہ :۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ہمارے دلوں کے تمام گوشے ایک دوسرے کے
سامنے آجائیں ۔ کوئی بھی چیز ڈھکی چھپی نہ رہے !

اختر :۔ فہمی ! تم جانتی ہو ، میرا کوئی راز ایسا نہیں جو تمہیں معلوم نہ ہو ۔ بلکہ میری زندگی
میں سرے سے کوئی راز ہے ہی نہیں ۔ تم کو تو معلوم ہے سب کچھ

فہمیدہ :۔ مگر اختر !

اختر :۔ کہو ۔

فہمیدہ : میرا ایک ایسا راز بھی ہے جو تمہیں معلوم نہیں ۔

(اختر گھور کر فہمیدہ کو دیکھتا ہے)

اختر :۔ میں نہیں سمجھ سکا ۔

فہمیدہ :۔ میری زندگی کا ایک ایسا راز بھی ہے جو تم نہیں جانتے !

(اختر بے اختیاری کے عالم میں چھڑی ہلاتا ہے)

یہی راز بتانے کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے ۔

(فہمیدہ خاموش ہو جاتی ہے ، اختر اُسے گھورتا رہتا ہے)

اختر :۔ فہمی !

فہمیدہ :۔ دیکھو اختر ! اگر کوئی شخص شاخ پر کھلے ہوئے پھول توڑ کر کیچڑ میں پھینک
دے تو قصور پھول کا ہے یا اس شخص کا جس نے اُسے کیچڑ میں پھینک دیا

اختر :۔ بھول کا کوئی قصور نہیں۔ قصور سراسر اس شخص کا ہے۔ مگر تم یہ سوال پوچھتی کیوں ہو؟

فہمیدہ :۔ بھول تو بے قصور ہے نا؟

اختر :۔ بالکل!

فہمیدہ :۔ مانتے ہونا؟

اختر :۔ آخر کہنا کیا چاہتی ہو فہمی!

فہمیدہ : (دور خلا میں دیکھتے ہوئے) میں اس وقت ڈیڑھ پونے دو سال کی بچی تھی — ایک شام میری خالہ زاد بہن مجھے اپنے ساتھ گھر سے کچھ دور ایک باغ میں لے گئی۔ میں باغ میں پھرنے لگی اور بہن مجھے چھوڑ کر اپنی سہیلیوں سے باتیں کرنے لگی۔ پھرتے پھرتے میں اس پودے کے پاس چلی گئی جو کچھ فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ اچانک دو ہاتھ میری جانب بڑھنے لگے۔ میں ڈر گئی — سہم گئی۔ سانس رکنے لگا۔ اس کے بعد (فہمیدہ ذرا رک کر اختر کو دیکھتی ہے جو بڑے غور سے اسے دیکھ رہا ہے) میں اپنے ارگرد ایک بالکل اجنبی فضا محسوس کرنے لگی۔ ایک بالکل اجنبی فضا۔ جہاں نہ تو مجھے اپنا ابا نظر آتا تھا اور نہ اماں دکھائی دیتی تھی۔ میں چیخ چیخ کر روتی رہی۔ رو رو کر چیختی رہی مگر نہ ابا آیا اور اماں۔

(فہمیدہ بدستور فضا میں دیکھ رہی ہے)

دن گزرنے لگے۔ گزرتے چلے گئے۔ میرا رونا دھونا ختم ہو گیا۔ وقت نے میرے زخموں پر پھاہا رکھ دیا۔ میرا ماضی مجھ سے دور ہونے لگا۔ روز بروز دور ہٹتا چلا گیا۔ میں جس گھر میں پرورش پا رہی تھی وہ — ایک طوائف کا گھر تھا۔

(اختر اپنی پیشانی پر بے اختیاری کے عالم میں ہاتھ پھیرتا ہے۔ فہمیدہ کی نظریں وہیں خلا میں بھٹک رہی ہیں)

اس چار دیواری میں میری زندگی کے تیرہ برس گذر گئے!

(ایک لمحے کے لیے رُک جاتی ہے)

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ طوائف کی اپنی بہن سے دشمنی ہو گئی۔ اس کی بہن نے مجھے اغوا کا سارا واقعہ بتا دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ کون شخص مجھے کون سے شہر اور کس محلے سے لایا تھا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ میرے دل میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ اس کثیف اور گندے ماحول میں اب ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔

(فہمیدہ پھر دو تین لمحوں کے لئے خاموش ہو جاتی ہے)

طوائف کو میری نیت معلوم ہوئی تو بڑے پیار سے کہنے لگی "واپس جانا چاہتی ہو، شوق سے جاؤ مگر تمہاری زندگی داغدار ہو چکی ہے۔ یہ سوسائٹی تمہیں قبول نہیں کرے گی!" میں جانتی تھی یہ عورت مجھے بہکا رہی ہے۔ میں نے اس کی کوئی بات نہ سنی اور ایک رات میں اپنی پیاری دنیا میں لوٹ آئی۔ ماں نے چھاتی سے لگا لیا۔ باپ میرے آنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

(فہمیدہ خاموش ہو جاتی ہے)

اختر:۔ تو ــــــ

فہمیدہ:۔ (اختر کی طرف دیکھتے ہوئے) یہی میرا راز ہے جو اب تک تم سے پوشیدہ تھا اور آج یہی راز بتانے کے لئے میں نے تمہیں بلایا تھا۔

اختر:۔ میں نے سن لیا ہے۔

فہمیدہ:۔ اختر! میری ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس راز کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں دفن کر دوں گی، اور کبھی اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کروں گی۔ اس راز کی خاطر ہم نے اپنا شہر چھوڑ دیا۔ وہ شہر جہاں میں نے زندگی کا پہلا سانس لیا تھا اور جو مجھے بہت عزیز تھا۔ یہاں پہنچ کر

مجھے یوں لگا جیسے میں ایک نئی دنیا میں آگئی ہوں - پھر تم میری زندگی میں آگئے
— تم آئے تو زندگی کی سچی خوشیاں آگئیں - اور کل —

(فہمیدہ یکلخت رُک جاتی ہے)

مگر اختر!

اختر:- کیا ہے فہمی

فہمیدہ:- تم کیا سوچ رہے ہو؟

اختر:- صرف ایک بات!

فہمیدہ:- (لہجے میں قدرے پریشانی) بتا دو - صاف صاف بتا دو!

اختر:- میں وہی بات سوچ رہا ہوں - قصور کیچڑ میں پھینکنے والا کا ہے - پھول کا ہرگز نہیں -

فہمیدہ:- اختر (لہجے میں خوشی اور اضطراب لیے) میرے اختر!

(فہمیدہ اپنا سر اُس کے شانے سے لگا دیتی ہے)

اختر:- (فہمیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) اب یہ ہاتھ صرف موت ہی جُدا کر سکتی ہے -

فہمیدہ: اب میرا دل مطمئن ہو گیا ہے - اب میرے دل میں کوئی بے چینی نہیں! ہم دونوں ساتھ ساتھ سفر کریں گے - ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ہمیشہ کے ساتھی بن کر ایک دوسرے کے سچے دمساز و ہمراز بن کر - ہر دُکھ میں شریک، ہر سُکھ میں شامل - آخری سانس تک میرا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں اور تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں رہے گا -

(فہمیدہ فرطِ تاثر میں آنکھ بند کر لیتی ہیں)

اختر:- میری فہمی!

(اختر فہمیدہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتا ہے۔ فہمیدہ کی آنکھیں بند ہیں اور پردہ گرتا ہے۔

جب دوبارہ پردہ اٹھتا ہے تو ہم سٹیج پر ایک سادہ کمرہ دیکھتے ہیں۔ کمرے میں دو کرسیوں اور ایک تپائی کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں ہے — پردہ اٹھنے کے دو تین لمحے بعد فہمیدہ ہاتھ میں ایک شاندار اور خوبصورت سوٹ لیے گنگناتی ہوئی سٹیج پر آتی ہے۔ کپڑے کرسی پر رکھ دیتی ہے۔ باہر سے ماں کی آواز آتی ہے۔ "فہمیدہ بیٹی" دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اور ذرا بلند آواز میں جواب دیتی ہے "اچھا ماں" یہ کہہ کر دروازے کی جانب قدم اٹھاتی ہے۔ ابھی دروازے سے دور ہی ہے کہ ماں داخل ہوتی ہے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ، لباس شلوار، قمیض، سویٹر اور شال۔ اس وقت اس نے ہاتھ میں ٹرے اٹھا رکھی ہے۔ جس میں چائے کی پیالی کے علاوہ ایک پلیٹ میں کچھ بسکٹ بھی ہیں۔ فہمیدہ آگے بڑھ کر جلدی سے ٹرے اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور تپائی پر رکھ دیتی ہے)

فہمیدہ :- اماں! آپ نے کیوں تکلیف کی ہے؟

ماں :- تکلیف کیسی بیٹی! اب تو تو — (مسکرا کر) اس گھر میں مہمان ہے۔

(فہمیدہ شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)

اللہ تیرے نصیب اچھے ہوں۔ اپنے میاں کے گھر میں ہمیشہ خوش رہے!

(ماں آگے بڑھ کر فہمیدہ کی پیشانی چوم لیتی ہے)

ہاں فہمیدہ بیٹی! جلدی ادھر آجاؤ۔ تمہاری سہیلیاں بلا رہی ہیں۔

فہمیدہ :- ابھی آتی ہوں لباس بدل کر۔ بس دو منٹ میں۔

ماں :- اچھا —!

(ماں مسکرا کر فہمیدہ کو دیکھتی ہے اور جانے لگتی ہے۔ جب وہ دروازے میں سے

نکل جاتی ہے تو فہمیدہ مُسکرا کر ماتھے پر سے ماں کے بوسے کی نمی خشک کرتی ہے
اس کی نظر لباس پر پڑتی ہے۔ پہلے کی طرح گنگنانے لگتی ہے۔ دروازے تک جاتی
ہے۔ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ واپس آتی ہے۔ چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے
لگاتی ہے۔ دو گھونٹ پی کر کرسی کی طرف بڑھتی ہے۔ پیالی بائیں ہاتھ میں لے
کر قمیض اٹھاتی ہے، اس کا جائزہ لیتی ہے اور اُسے کرسی کے بازو پر پھیلا
دیتی ہے۔ ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈالتی ہے۔
سازینے کی آواز آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے باہر کسی نے سازوں کا ریکارڈ لگا
دیا ہے اس کے ساتھ ہی قہقہوں کا شور بھی بلند ہوتا ہے قہقہے تھم جاتے
ہیں۔ ریکارڈ کی آواز آتی رہتی ہے۔ فہمیدہ چائے ختم کر کے پیالی ٹرے میں رکھ
دیتی ہے۔

دروازے پر دستک ہوتی ہے۔

فہمیدہ کو دستک کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ لباس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ دروازے
پر پھر دستک ہوتی ہے۔

اب کے فہمیدہ کو دستک کا علم ہو جاتا ہے: "اچھا" کہہ کر دروازے کی طرف قدم
اٹھانے لگتی ہے۔

دروازہ کھولتی ہے۔ ایک دم شور بڑھ جاتا ہے

دروازے پر اس کی ماں کھڑی ہے۔ چہرہ زرد، ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔

فہمیدہ بے اختیار پکارتی ہے "اماں"

ماں آگے آتی ہے۔ ایسا اشارہ کرتی ہے جیسے کہہ رہی ہو "دروازہ بند کر دو"
فہمیدہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ شور تھم جاتا ہے۔

فہمیدہ:۔ کیا ہوا اماں!—

ماں :۔ پتہ نہیں میری نگاہوں کو کیا ہو گیا ہے

فہمیدہ :۔ ہوا کیا اماں !

ماں :۔ دیکھو تو —

(ماں ایک کاغذ فہمیدہ کی طرف بڑھاتی ہے)

اختر کی والدہ نے بھیجا ہے۔

(فہمیدہ کاغذ کھول کر پڑھتی ہے۔ پڑھتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے)

میں نے غلط پڑھا ہے۔ تم پڑھو۔

فہمیدہ :۔ اماں !

ماں :۔ تم پڑھو نا !

فہمیدہ :۔ آپ نے ٹھیک پڑھا ہے — ٹھیک پڑھا ہے اماں !

ماں :۔ اختر کی ماں نے یہی لکھا ہے کہ یہ رشتہ منظور نہیں !

(فہمیدہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ ماں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتی رہتی ہے)

پر کیوں ؟ یہ ہوا کیا ہے — ایسا ہوا کیوں ہے ؟ ۔ یہ کیا ہے فہمیدہ ! — بولتی نہیں ہو ؟

(فہمیدہ چپ چاپ کھڑی رہتی ہے)

وہ لوگ آنے والے تھے — سب کچھ طے ہو گیا تھا — پھر — پھر — یہ کیا ہوا — یہ کیا لکھ دیا ہے انہوں نے ۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں فہمیدہ !

فہمیدہ :۔ کیا پوچھ رہی ہیں ؟

ماں :۔ یہ کیا ہے ؟ — آخر یہ کیا ہے ؟

فہمیدہ :۔ میں جانتی ہوں اماں !

ماں :۔ تو کیا جانتی ہے ؟

فہمیدہ :۔ میں نے اختر کو وہ بات بتا دی تھی۔

ماں :۔ کون سی بات ؟

(فہمیدہ دو تین لمحے خاموش رہتی ہے)

فہمیدہ :۔ میں نے سوچا تھا اگر ایسا نہیں کروں گی تو میرے دل پر ایک بوجھ سا رہیگا !۔
میرے دل میں ایک خلش سی ہوتی رہے گی۔

ماں :۔ تو نے اُسے بتا دیا — پر میں نے تجھے منع جو کیا تھا۔ تو نے مجھ سے وعدہ
جو کیا تھا —

فہمیدہ :۔ میں نے وعدہ توڑ دیا تھا۔

ماں :۔ تو نے وعدہ توڑ دیا تھا۔ تو نے — اوہ میرے اللہ !

(ماں لڑکھڑا کر گر پڑتی ہے۔ فہمیدہ چیختی ہوئی آواز میں "اماں" کہہ کر اس
پر جھکتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے پردہ گرتا ہے۔
تین چار لمحوں کے بعد اسی کمرے میں پردہ اٹھتا ہے۔
فہمیدہ کے سوا اسٹیج پر اور کوئی نہیں ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔
ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی ہے۔ شیشی کا کاک ہٹا کر وہ تھرتھراتے ہوئے ہاتھ
سے شیشی کو ہونٹوں تک لے جانے لگتی ہے۔ یک لخت دروازے میں سے
اختر تیزی سے آتا ہے اور "فہمی" کہہ کر شیشی اس کے ہونٹوں سے الگ کر دیتا
ہے)

اختر :۔ یہ کیا کر رہی ہو فہمی !

فہمیدہ :۔ اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے تم نے موت کی طرف دھکیل دیا۔ ماں
چل بسی۔ اب زندہ رہنے کا کیا سہارا ہے۔ مجھے مرنے دو۔

اختر :۔ نہیں۔ نہیں۔

(اچانک تماشائیوں کی طرف سے کسی کی آواز بلند ہوتی ہے "نہیں، نہیں" دونوں فنکار حیران ہوکر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ جدھر سے آواز آئی ہے۔
ایک شخص جس نے سیاہ رنگ کی اچکن پہن رکھی ہے، سٹیج پر آجاتا ہے۔ جلدی سے مینجر سٹیج پر نمودار ہو جاتا ہے۔)

مینجر:۔ نووارد سے) تم کون ہو؟

نووارد:۔ تم نے میرے ڈرامے کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ میرا لکھا ہوا سین ہرگز نہیں۔ تم نے میرا ڈراما بدل دیا ہے۔

مینجر:۔ مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔

نووارد:۔ مگر — میں نے ایسا ہرگز نہیں لکھا۔ میں نے دکھایا تھا کہ ہیروئن ماں کے مرنے پر روپوش ہو جاتی ہے۔ بعد میں ہیرو کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور میرا ڈراما اس کے احساسِ ندامت پر ختم ہوتا ہے۔

مینجر:۔ ہم نے مناسب تبدیلی کی ہے۔ جائیے۔ ہمارا وقت خراب نہ کیجیے۔ عجیب پاگل پن کر رہے ہیں۔ جائیے۔ جلدی کیجیے۔

نووارد:۔ آپ نے مناسب تبدیلی کی ہے۔ مگر میرا ڈراما تباہ ہو گیا ہے۔ آپ نہیں جانتے آپ کی اس تبدیلی سے میرے دل پر کتنا گہرا چرکا لگا ہے مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا۔ وہی دکھایئے جو میں نے لکھا تھا — میں نے لکھا تھا کہ —

مینجر:۔ (نووارد کو پرے ہٹاتے ہوئے) جاؤ — چلے جاؤ — ورنہ —

نووارد:۔ میرا بدنصیب ہیرو اپنی ہیروئن کو کہیں بھی نہیں دیکھ سکتا۔

مینجر:۔ تم تو سچ مچ پاگل ہو گئے ہو —

نووارد:۔ (اپنے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے) اس کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند غائب ہو چکی ہے۔ اس کے مضطرب دل کو کہیں قرار نہیں ملتا۔ روح کی

آگ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اس آگ میں اس کا صبر و قرار جل کر خاک ہو چکا ہے۔ اس کی رگ رگ میں نشتر سے چبھ رہے ہیں

مینیجر: جاتے ہو کہ نہیں ؟

(مینیجر نووارد کو دھکیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تماشائیوں کی طرف سے شور بلند ہوتا ہے)

("رہنے دو — بولنے دو — چھوڑ دو")

عجب مصیبت ہے۔

(مینجر نووارد کو چھوڑ دیتا ہے)

نووارد: یہاں میں نے وہ منظر دکھایا تھا جہاں ہیرو کہہ رہا ہے۔

(نووارد ڈرامائی انداز میں بولنے لگتا ہے)

فہمی ! تو نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ زمین کے کس حصے میں جا چھپی ہے۔ میں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکا ہوں۔ مجھے جو سزا تو نے دی ہے میں اس کا مستحق تھا۔ افسوس جلد بازی نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ میں نے تیرا راز اپنے ماں باپ کو بتا دیا۔ اور ان کی زہر آلود باتوں نے مجھے بہکا دیا — مجھے غلط راستے پر لگا دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اپنی معصوم محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ تو نے سچے پیار کا جو ہار میرے گلے میں ڈالا تھا۔ میں نے اسے نوچ کر پرے پھینک دیا۔ جب میرا ضمیر جاگا تو تو نہ جانے کہاں جا چکی تھی۔ میں اپنے دل کو یہ یقین نہیں دلا سکا کہ تو اس دنیا میں موجود نہیں ہے — میرے کانوں میں ایک آواز آتی رہتی ہے — فہمی مری نہیں — فہمی زندہ ہے۔ اگر تو ایک مرتبہ آ جائے تو میں اپنی زندگی کے سارے آنسو تیرے پاؤں پر بہا دوں — فہمی! — میری فہمی !! تو کہاں ہے ؟ — میں تیرے لیے تڑپ رہا ہوں۔ تو میری

دنیا کی روشنی، میرے باغ کی بہار، میری زندگی کا قرار ہے۔ مگر جب سے تو بچھڑ گئی ہے تیری یاد میری آنکھ کا آنسو، میرے سینے کی خلش اور میرے دل کا درد بن گئی ہے۔ فہمی!۔

(تماشائیوں کی طرف سے ایک آواز آتی ہے: "اختر"
مینجر۔ اور دونوں فنکار ادھر دیکھنے لگتے ہیں جدھر سے آواز آئی ہے
نووارد کو آواز کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ بدستور اپنی جذباتی رو میں بہے
چلا جا رہا ہے)

ایک لمحے کے لیے آجا۔ اور کہہ دے میں نے تجھے معاف کر دیا اختر!

("اختر" کہتی ہوئی آواز پھر آتی ہے۔ نووارد ادھر دیکھتا ہے
ایک عورت سٹیج پر آتی ہے)

عورت: اختر

نووارد:۔ تم۔ کون؟

عورت:۔ تمہاری فہمی!

نووارد:۔ تم فہمی۔

عورت:۔ میں نے دل سے وعدہ کیا تھا کہ آخری سانس تک تم سے نہیں ملوں گی۔ مگر آج تمہاری بے تابی دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ آج میں نے دوبارہ وعدہ توڑ دیا ہے۔

نووارد:۔ فہمی!۔ میری فہمی!!

(نووارد عورت کی طرف بڑھتا ہے اور
پردہ بڑی تیزی سے گرتا ہے۔

اندھیروں کے سائے

کردار

سجاد

پروین

آصف

سٹیج سجاد کی کوٹھی سے ملحق باغ کا وہ حصہ سامنے لاتی ہے جس میں اس تمثیل کے واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ باغ کے وسط میں دو کرسیاں، ان کے درمیان ایک تپائی۔ کچھ دور مشرقی گوشے میں ایک آرام کرسی۔ ایک دروازہ دائیں جانب جو کوٹھی کے برآمدے میں کھلتا ہے۔ دوسرا بائیں طرف جس کے سامنے سڑک ہے

بہار کا موسم۔ چاندنی چھٹکی ہوئی۔ رات کا ابتدائی حصہ۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے باغ میں کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا چند لمحوں کے بعد سجاد دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے فوراً بعد پروین بھی آجاتی ہے۔ کرسیوں کے پاس پہنچ کر سجاد رُک جاتا ہے۔ پروین کو دیکھتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلی آرہی ہے۔ وہ بھی وہاں آکر ٹھہر جاتی ہے اور شرما کر، لجا کر، مسکرا کر نگاہیں جھکا لیتی ہے۔ ایک کرسی کھسکا کر اپنے قریب تر لے آتی ہے اور ذرا جھک کر اس کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

سجاد بڑھیا سوٹ میں ملبوس ہے۔ عمر تیس کے لگ بھگ۔ درمیانہ قد۔ چہرہ

صاف۔ پروین بڑے بڑے گلاب کے پھولوں والی سفید رنگ کی ساڑھی
پہنے ہوئے ہے۔ کھلتا ہوا رنگ۔ چہرہ ایک خاص باوقار دلکشی لیے ہوئے
ہے۔ داہنے ہاتھ میں پیازی رنگ کا رومال جس سے گفتگو کے دوران غیر اختیاری
طور پر کئی بار پیشانی اور رخسار پونچھتی ہے۔ عمر بائیس اور پچیس کے درمیان۔
سجاد کوٹ کی جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالتا ہے۔ سگریٹ لے
کر لائٹر سے سلگاتا ہے اور پھر اپنی نگاہیں پروین پر مرتکز کرکے آہستہ آہستہ
کش لگانے لگتا ہے۔ پروین شرما کر سمٹنے سی لگتی ہے۔
سجاد سگریٹ کیس اور لائٹر ہاتھ ہی میں رکھتا ہے۔
چند لمحے خاموشی کے عالم میں گزر جاتے ہیں۔ سجاد ایک لمبا کش لگاتا ہے۔
پھر سگریٹ ہونٹوں سے ہٹا لیتا ہے۔ پروین یہ محسوس کرکے کہ اب وہ کچھ کہنے والا
ہے۔ ہاتھ کرسی سے الگ کرکے رومال سے پیشانی پونچھنے لگتی ہے۔

سجاد: تو پروین!

(پروین ایک لمحے کے لیے نظریں اٹھا کر دیکھتی ہے۔ مگر خاموش رہتی ہے)

میں نے کہا — پروین!

پروین:۔ جی! (نگاہیں جھکی رہتی ہیں)

سجاد:۔ مجھے تو یہ ایک سپنا معلوم ہوتا ہے۔

پروین:۔ (بدستور اسی عالم میں) کیا؟

سجاد:۔ ہماری شادی

پروین:۔ مجھے تو — حقیقت لگتی ہے (پروین رومال اپنی آنکھوں پر رکھ لیتی ہے)

سجاد: ہے تو حقیقت ہی مگر حقیقت جو کئی رکاوٹوں سے گزر کر آئے وہ سپنا ہی محسوس
ہوتی ہے۔

پروین :۔ آپ شاید مایوس ہو گئے تھے !

(پروین رومال آنکھوں سے ہٹا لیتی ہے۔ دایاں ہاتھ کرسی کی پشت پر

رکھ دیتی ہے)

سجاد :۔ اور تم ـــــ ؟

پروین :۔ (شرما کر) میں ـــــ نہیں

سجاد :۔ گویا تم سمجھتی تھیں کہ ان رکاوٹوں کے باوجود شادی ہو کر رہے گی ۔

پروین :۔ (شرما کر) شاید

سجاد :۔ شاید ؟

پروین :۔ اگر زیادہ پر امید نہیں تھی تو خاص مایوس بھی نہیں تھی !

سجاد :۔ (مسکرا کر) تمہارا رویہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا اور اس سے مجھے پریشانی ہوتی تھی

کافی پریشانی ہوتی تھی ۔

پروین :۔ جانتی ہوں ۔

سجاد :۔ نہ جانے تم کیوں ایک معما بن گئی تھیں ۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا تھا ، شاید تم

اس رشتے سے خوش نہیں ہو ۔

پروین :۔ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ آپ کی غلط فہمی تھی ۔

سجاد :۔ یوں بھی سوچا جا سکتا ہے ۔

پروین :۔ سوچنے کا دوسرا طریقہ کیا ہے ؟

(پروین کرسی کی پشت پر سے ہاتھ اٹھا لیتی ہے اور نظریں اٹھا کر سجاد کو دیکھتی ہے ۔

سجاد خاموش رہتا ہے اور سگریٹ کے کش لگاتا رہتا ہے ۔ اس وقت وہ

لائٹر کو دیکھ رہا ہے)

سجاد :۔ سوچنے کا دوسرا طریقہ ؟ ـــــ ایک کیا کئی طریقے ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً اس طرح بھی سمجھا

جا سکتا ہے کہ تمہارے سامنے کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔

پروین : کیا فرمایا ؟

سجاد : میرا مطلب ہے ۔ کہ یوں بھی سوچنے والا سوچ سکتا ہے ۔ ویسے یوں سوچنا نہیں چاہیئے ۔ کیا ضرورت ہے اس طرح سوچنے کی !

پروین :۔ جی !

سجاد : میری بات سمجھ لی نا ۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں کہ تم نے ضرور اس طرح سوچا ہو گا ۔ میں صرف امکان کی بات کر رہا ہوں ۔ خیر اب ان باتوں کا کیا ذکر ۔

(سجاد پھر سگرٹ کے کش لینے لگتا ہے)

پروین :۔ آپ کے دل میں کوئی چیز ہے تو بتا دیجئے ۔

سجاد :۔ ضرورت ؟

پروین :۔ ہو سکتا ہے ڈھکے چھپے اندیشے ہمارے مستقبل پر بھی اپنی پرچھائیں ڈال دیں ۔ ہمیں ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ لینا چاہیئے !

سجاد :۔ مجھے رہ رہ کر صرف یہ خیال آتا ہے کہ تمہارا رویہ کچھ عجیب و غریب کیوں ہو گیا تھا ! ۔ ہو سکتا ہے یہ محض میری غلط فہمی ہو !

پروین :۔ اس کا مجھے اس وقت بھی احساس تھا اور آج بھی ہے ۔

سجاد :۔ یعنی تم جانتی تھیں کہ تمہارا رویہ مناسب نہیں ہے ۔

(پروین دو تین لمحوں کے لئے خاموش رہتی ہے)

یہی بات ہے نا ؟

پروین :۔ نہیں !

سجاد :۔ تم اس معاملے میں حق بجانب تھیں ؟

پروین :۔ میں اپنی دلی کیفیت چھپا نہیں سکتی تھی ۔

سجاد: (گھور کر پروین کو دیکھتا ہے) اس کیفیت کی وجہ کیا تھی؟

پروین: آپ جانتے ہیں ابا جان کچھ مدت پہلے آپ کو ناپسند کرتے تھے۔ آپ کے مقابلے میں آصف کو پسند کرتے تھے۔

سجاد: (سگریٹ نیچے پھینک کر اس پر پاؤں رکھ دیتا ہے) لیکن بعد میں ان کی رائے بدل گئی تھی۔

پروین: ہاں وہ بھی امی کے ہمنوا ہو گئے تھے۔

سجاد: تو اس سے تمہاری دلی کیفیت کا کیا تعلق ہے؟

پروین: آپ کو یاد ہے ہماری شادی سے تین ہفتے پہلے آپ کی سعیدہ کی سالگرہ تھی! جس میں آصف بھی شامل ہوا تھا۔

سجاد: یاد ہے۔

پروین: اس دن اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا کہ امی اور ابا کی ایک رائے ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے اُسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

سجاد: یقیناً (سجاد سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالتا ہے مگر اُسے سلگاتا نہیں)

پروین: ابھی سالگرہ کی تقریب ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے مجھے اشارے سے کوٹھی کے باہر دالان میں بلایا۔

(سجاد سگریٹ سلگانے لگتا ہے۔ پروین خاموش ہو جاتی ہے۔ سجاد اس کی طرف اس انداز سے دیکھتا ہے جیسے پوچھ رہا ہو ——— تم خاموش کیوں ہو گئی ہو)

اور کہنے لگا ——— مجھے پرانے پل پر ملو ——— ورنہ ——— میں ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا

(پروین رومال چہرے پر پھیرنے لگتی ہے۔ سجاد جلدی جلدی کش لگاتا ہوا ادھر دیکھتا رہتا ہے)

سجاد: پھر تم نے کیا کیا؟

پروین: میں کیا کر سکتی تھی بھلا — اندر آ گئی

سجاد: اس نے روکا تو ہوگا؟

پروین: وہ الفاظ کہتے ہی چلا گیا - ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہرا۔

سجاد: ٹھہر جاتا تو —

پروین: ٹھہر جاتا تو — مگر وہ ٹھہرا تو نہیں تھا! (پروین خاموش ہو جاتی ہے)

سجاد: کچھ سوچنے لگیں؟

پروین: کچھ نہیں — اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے وہ الفاظ کہتے ہی چلا گیا یہ اس کی حماقت تھی۔ سمجھتا ہوگا میں اسے روک لوں گی - اس کے پیچھے بھاگوں گی اور کہوں گی (مسکرا کر) نہ جانے کیا کچھ کہوں گی - یہ تو ایک جذباتی رویہ ہوتا۔ میں ایسی حرکت کیوں کرتی - وہ احمق تھا — میں تو احمق نہیں تھی۔

سجاد: فرض کیا وہ ٹھہر کر تمہارے جواب کا انتظار کرتا تو —

پروین: میں کچھ بھی نہ کہتی

سجاد: خاموش رہتیں!

پروین: آخر میں اس سے کہہ بھی کیا سکتی تھی؟

سجاد: کچھ نہ کچھ تو ضرور کہتیں۔

پروین: حماقت کا شاید کوئی جواب نہیں ہوتا۔

سجاد: تمہارے خیال میں اس نے حماقت کی تھی؟

پروین: یقیناً — بغیر کسی وجہ کے اپنا گھر بار ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے!

سجاد: سچ کہتی ہو — اس کی جگہ میں ہوتا تو میرا ردِّ عمل مختلف ہوتا۔

پروین : آپ تو — (پروین مسکراتی ہے) آپ ہیں!

سجاد : یعنی کیا؟

پروین : بہت اچھے ہیں آپ!

سجاد : ممکن ہے . وہ اس دنیا ہی میں نہ ہو — وہ یہ بھی کر سکتا تھا۔

پروین : نہیں — وہ زندہ ہوگا — مگر کیا پتہ — کیا پتہ؟

سجاد : تو اسی لیے پریشان ہو جاتی تھیں تم؟

پروین : صرف یہ خیال آتا تھا۔

سجاد : کیا؟

(پروین کا رومال نیچے گر پڑتا ہے اور وہ اپنی انگلی یونہی دوسری انگلی کے اردگرد پھیر رہی ہے۔ سجاد اس کا رومال اٹھا کر دیتا ہے)

پروین : یہی کہ اس نے اچھا طریقہ اختیار نہیں کیا

سجاد : (سگریٹ سلگاتے ہوئے) ہوں!

پروین : میرا عزیز بھی تو تھا۔

سجاد : اس کے علاوہ ہم تینوں بچپن کے ساتھی بھی تھے اور ایک ساتھ تعلیم پائی تھی۔ تینوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔

پروین : لیکن وہ جب کبھی بڑا جذباتی ہو جاتا تھا تو مجھے اس سے نفرت سی ہونے لگتی تھی اور اب تو —

سجاد : اور اب تو —

پروین : اس کے نام سے بھی نفرت ہو گئی ہے — بھلا ایسا احمق آدمی نفرت کے قابل نہیں تو اور کس کے قابل ہوگا۔ آخر بیہودگی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ وہ تو انتہا سے بھی آگے نکل گیا تھا۔

سجاد : (سگریٹ کے کش لگا رہا ہے اور پروین کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا ہے)
درُست !— بالکل

پروین: ذرا سوچیے نا اس نے یہ کیسی حرکت کی ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے اب کبھی
اس کے گھر بھی نہیں جاؤں گی۔

سجاد : یہ تو نہ ہونا چاہیے۔

پروین : خواہ مخواہ اس کی بیوقوفی یاد آجائے گی۔

سجاد : وہ تو ویسے بھی یاد آسکتی ہے —تم پریشان ہو جاتی تھیں نا۔

پروین: ہو جاتی تھی اب تو نہیں ہوتی۔

سجاد : اب نہیں ؟

پروین : بالکل نہیں — میرا اس کا واسطہ کیا رہا — میں ادھر آگئی — اور —
(مسکرا کر سجاد کو دیکھتی ہے)

سجاد : (مسکرا کر) آج ہماری شادی کی پہلی رات ہے۔

پروین: (ہلکا سا قہقہہ لگا کر) کچھ ہم بھی وہ ہیں !

سجاد : یعنی !

پروین : (آنکھیں جھکا کر) دیکھیے نا آج ہماری شادی کی پہلی رات ہے۔

سجاد : یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔

پروین : یہ رات عام راتوں سے بہت مختلف ہوتی ہے !

سجاد : سنا تم یہی ہے۔

پروین : یہ رات نغموں کے افق سے طلوع ہوتی ہے اور خوشبوؤں کی وادی میں
اتر جاتی ہے —چاندنی کی طرح جو چپ چاپ جھیل کی گہرائیوں میں آسودہ
ہو جائے۔ آج کی رات تو صرف پھولوں، صرف خوشبوؤں کی باتیں ہوتی

چاہئیں - ان پھولوں کی جو بہار کی رنگینیوں میں آنکھیں کھولتے ہیں اور اُن خوشبوؤں کی جو پھولوں کے سینے سے پھوٹ پڑتی ہیں - آج کی رات کا ہر لمحہ ایک سہانا گیت ہے جو روح کی موسیقی میں جذب ہو جاتا ہے کیا ایسی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔

سجاد : (سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے) ہونی چاہئیں - کون روکتا ہے تمہیں ؟

پروین : (ہلکا سا قہقہہ لگاکر) صرف میں کروں — آپ نہیں -

سجاد : (مسکرا کر) نہیں دونوں کریں گے -

پروین : (رومال دائیں ہاتھ کی انگلی پر لپیٹے ہوئے) آپ کو وہ شرارت یاد ہے نا - بچپن کی - جب میں نے ریت کا گھروندا بنایا تھا - اور آپ سے کہا تھا - یہ گھر آپ کا ہے، آپ کتنے خوش ہوئے تھے — آپ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں — اور آپ خوشی کے جوش میں ناچنے لگے تھے -

سجاد : شرارت کی بات تو تم بھول ہی گئی ہو -

پروین : کون سی ؟

سجاد : تم نے چوری چھپے آصف کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ گھر تمہارا ہے -

پروین : ہرگز نہیں - میں نے اس سے یہ الفاظ ہرگز نہیں کہے تھے - مگر اس کا کیا علاج - وہ اسے اپنی ہی ملکیت سمجھتا تھا -

سجاد : اور سلیم کو تو ضرور کہہ دیا تھا کہ یہ صرف تمہارے لیے ہے -

پروین : سلیم مرحوم کا نام کیوں لیتے ہیں - وہ تو تم دونوں سے مختلف تھا - کبھی اس نے کوئی چیز نہ تو مانگی تھی اور نہ تم دونوں کی طرح لڑتا جھگڑتا تھا -

سجاد : میرے ساتھ تم نے ناانصافی کی تھی - مجھے صاف طور پہ کہہ جو دیا تھا کہ یہ گھر تمہارے لیے بنایا ہے - پھر اور آصف کا اس پر کیا حق تھا ؟

پروین : آصف مجھے گھر بناتے ہوئے دیکھتا تھا تو سمجھتا تھا میں اسی کے لیے بنا

رہی ہوں — پگلا تو وہ ہمیشہ سے ہے ۔ ساری عمر ایسی ہی واہیات حرکتیں کرتا رہا ہے ۔

سجاد : تم نے اس سے یہ تو ہرگز نہیں کہا تھا کہ یہ گھر تمہارا ہے ۔

پروین : اس نے یونہی سمجھ لیا تھا ۔

سجاد : تمہارا کیا خیال تھا ؟

پروین : (رومال سے ماتھا پونچھتے ہوئے) عجیب زمانہ تھا وہ بھی —

سجاد : میرے متعلق کیا خیال تھا تمہارا ؟

پروین : آپ تو بہت اچھے تھے ۔

سجاد : وہ کیوں ؟

پروین : آپ کبھی کبھی میری بات مان لیتے تھے مگر وہ — خواہ مخواہ بگڑ جاتا تھا — اور اتنا پریشان کر دیتا تھا کہ میں رو پڑتی تھی ۔ جی چاہتا تھا خوب خوب پیٹوں اسے اور ایک مرتبہ اسے پیٹ بھی دیا تھا ۔

سجاد : اور شاید بعد میں پچھتائی بھی تھیں ۔ اور زار و قطار رونے لگی تھیں ۔ تمہارے ساتھ وہ پگلا سلیم بھی رونے لگا تھا ۔

پروین : پچھتائی کب تھی — (پروین ذرا خاموش رہتی ہے) اس نے مجھے ہمیشہ دکھ دیا ہے ۔ اور میں ہمیشہ اس سے نفرت کرتی رہی ہوں ۔ اور اس حرکت سے تو یہ نفرت اور بھی بڑھ گئی ہے (روٹھنے کے انداز میں) توبہ ہے میری ! آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔ خواہ مخواہ اس کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں ۔ دفع ہو گیا ، اچھا ہوا ، اب کبھی اپنی واہیات صورت نہیں دکھائے گا ۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ کہیں دفع دفان ہو جائے ۔

(سجاد آرام کرسی تک جاتا ہے ۔ یونہی لائٹر دو مرتبہ روشن کرتا ہے ۔ پروین وہیں کھڑی رہتی ہے اور رومال اپنی انگلی کے گرد لپیٹنے میں مصروف رہتی ہے)

کیا بات ہے؟

(سجاد لوٹتا ہے)

سجاد: کچھ نہیں — تم نے درست کہا ہے۔ آج رات دو دلوں کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔

پروین: اسی لئے تو میں کہتی ہوں ہم کو گیتوں اور خوشبوؤں کی باتیں کرنی چاہیئیں۔ مجھے کسی کے فقرے یاد آ رہے ہیں جو اس نے اس رات کے بارے میں کہے تھے (مسکرا کر) کہتا ہے۔ اس رات بہ وہ روشنی ہوتی ہے کہ پیار ہزاروں لاکھوں ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔

سجاد: یہ فقرہ میں نے بھی سنا ہوا ہے۔

پروین: میں نے کسی کاپی میں پڑھا تھا۔

سجاد: کس کی کاپی میں —؟

پروین: اب یاد نہیں رہا کس کی کاپی تھی۔

سجاد: آصف کی تو نہیں تھی۔

پروین: ہرگز نہیں۔

سجاد: ممکن ہے سلیم کی ہو

پروین: ہو سکتا ہے — خاصے بھلے فقرے تھے۔ اب تو یاد ہی نہیں رہے — شاید کچھ ایسے الفاظ تھے — اے ہاں — یہ رات زندگی کا سارا حسن، سارا رنگ، سارا نور محبت پہ نچھاور کر دیتی ہے! — یہ رات ان راہوں سے گزرتی ہے جہاں زمین کا ہر ذرّہ ایک چاند بن کر چمک اٹھتا ہے — جہاں قدم قدم پہ کہکشاں کے ہار اور ستاروں کے موتی پڑے پامال ہوتے ہیں —

(ایک لخت چونک کر) کیا کہا ہے آپ نے؟

سجاد : یہ فقرے آصف نے رٹ رکھے تھے۔ اور وہ تمہیں سنا کر ستایا کرتا تھا!

پروین : ممکن ہے — وہ تو یونہی شور مچایا کرتا تھا — مگر — یہ اس کے اپنے فقرے تھوڑے تھے۔ سلیم سے سنے تھے اس نے! — واہ کمال کر دیتے ہیں آپ۔ وہ بات یاد دلا دیتے ہیں جسے میں بھول چکی ہوں۔

سجاد : (اس کے دائیں شانے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیتا ہے) مجھے اس کا افسوس ہے۔ تم نے بُرا تو نہیں مانا!

پروین : اب شرمندہ تو نہ کیجیے۔

(سجاد آرام کرسی کی طرف جاتا ہے۔ پروین کھڑی رہتی ہے۔ سگریٹ کے تین چار کش لگانے کے بعد سجاد واپس آتا ہے)

سجاد : آصف نفرت کے قابل ہرگز نہیں تھا۔

پروین : پھر آصف! خدا کی پناہ کیا ہو گیا ہے آپ کو (پروین حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

سجاد : سچ کہتا ہوں پروین! اس سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لیے کہ بے چارا مجبور تھا۔ (ذرا ہنس کر) حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا اسے کوئی بھی نہیں سمجھ سکا۔ میں اس کی صحیح کیفیت سمجھ گیا تھا۔ اس لیے کبھی نفرت نہیں کی اس سے! وہ اصل میں بچپن ہی سے اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا — (ہنس کر) تم بھی حیران ہو رہی ہو حالانکہ وہ ہمارے ساتھ کھیلتا رہا ہے — پڑھتا رہا ہے۔

(سجاد سگریٹ کے کش لگاتا ہے اور تیز نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے)

آخر وہ ایسی عجیب و غریب بلکہ بعض اوقات شرمناک حرکتیں کرتا کیوں تھا؟

(پروین اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی ہے)

میں جانتا ہوں — وہ کبھی کبھی پُر اسرار حرکتیں کر بیٹھتا تھا! — اور اس کی وجہ سے

مجھے بھی لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا تھا — کئی واقعات بتا سکتا ہوں —

مگر — کیوں پروین!

پروین: (بیزاری سے) جی!

سجاد: ایسا شخص جو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے — نفرت کے قابل نہیں ہوتا —
رحم کے قابل ہوتا ہے۔ آخر اس بے چارے کا قصور بھی کیا تھا۔ پاگل پن تو اسے
ورثے میں ملا تھا۔

پروین: کیا قصّہ لے بیٹھے ہیں آپ!

سجاد: تم نہیں جانتیں — اس کا دادا کئی سال تک پاگل خانے میں رہا تھا۔ باپ سوتے
میں چیخ اٹھتا تھا۔ اور کئی بار اس نے چھت سے چھلانگ لگانے کی کوشش
بھی کی تھی۔ جس شخص نے ایسے ماحول میں پرورش پائی ہو وہ بُرے اور بھلے میں
بہت کم تمیز کر سکتا ہے! — میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ اس کا باقاعدہ
علاج کرواؤں گا لیکن — (سجاد سگریٹ پھینک کر نیا سگریٹ سلگاتا ہے) ہو سکتا
ہے مرا نہ ہو اور ایک دن آ جائے۔

(پروین ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

دماغی فتور انسان کو عجیب حرکتوں پر مجبور کر دیتا ہے۔

(شاید سگریٹ بجھ گیا ہے۔ سجاد دوبارہ لائٹر سے سلگاتا ہے اور غور سے پروین
کے چہرے کا مطالعہ کرتا ہے)

کافی پینے کا موڈ ہے کیا؟

پروین: جی — (چونک کر) کیا فرمایا آپ نے؟

سجاد: کافی!

پروین: کیا؟ — اے — کوئی — نہیں — جی نہیں چاہتا — آپ پیئیں

شوق ہے۔

سجاد : کیا حرج ہے۔ پی لو!

پروین : اچھا۔

(سجاد دائیں دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ ابھی وہ دروازے پر پہنچا ہی ہے کہ بائیں دروازے سے آصف داخل ہوتا ہے۔

پروین بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

سجاد مڑ کر دیکھتا ہے۔ آصف آگے آتا ہے۔

آصف سجاد کا ہم عمر ہے قمیص اور پتلون پہنے ہوئے۔ لمبا چہرہ، رنگ کسی قدر پیلا۔ سجاد واپس آنے لگتا ہے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں)

آصف : معافی کا خواستگار ہوں۔ اس موقعے پر میرا یہاں آنا سخت غیر مناسب ہے۔

سجاد : میں پہلے ہی جانتا تھا۔

آصف : آپ جانتے تھے کہ میں اس وقت آ جاؤں گا۔

سجاد : تم سے ہر حرکت کی توقع کی جاسکتی ہے۔

(سجاد پروین کی طرف دیکھتا ہے جو ٹکٹکی باندھ کر آصف کو دیکھ رہی ہے)

آصف : یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔

سجاد : یہ حرکت تم نہ کرتے تو اور کون کرتا؟

آصف : بجا فرمایا آپ نے!

(سجاد گھور کر آصف کو دیکھتا ہے)

سجاد : انتہا ہے پاگل پن کی۔

آصف : (سر جھکائے ہوئے) مجھے اس بدتمیزی کا اعتراف ہے۔

سجاد : (جلدی سے) کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہاری ذہنی کیفیت کیا ہے۔

(آصف گھور کر سجاد کو دیکھتا ہے وہ اس طرح سگریٹ پی رہا ہے جیسے
بڑا مطمئن ہے)

آصف : تم جو کچھ سمجھ رہے ہو وہ اپنی جگہ درست ہے
سجاد : یہ بھی کہنے کی ضرورت ہے ؟ - خیر اب تم آ گئے ہو تو مجھے اپنے پرانے دوست
کی ضرور مہمان نوازی کرنی چاہیئے — کیا پیش کیا جائے ؟ کافی پیو گے یا کچھ اور —
آصف : بہت بہت شکریہ — مگر ایک بات تم نے غلط کہی ہے ۔
سجاد : کیا بات ؟
آصف : میں تمہارا پرانا دوست نہیں پرانا دشمن ہوں ۔ یہ بات مجھ سے زیادہ تم جانتے
ہو ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں اور اب بھی دشمن ہیں ۔
سجاد : میں نے تمہیں کبھی دشمن نہیں سمجھا ۔ اس لیے کہ ایک صحیح الدماغ آدمی کسی ایسے
شخص کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا جس کی دماغی حالت قابلِ رحم ہو ۔
آصف : بہت عقلمند بننے کی کوشش مت کرو ! ابھی جو کچھ کہنے والا ہوں ۔ اس
سے یہ ساری عقلمندی دھوئیں کی طرح اڑ جائے گی (سینے پہ ہاتھ رکھ کر) بڑے
عقلمند بنے پھرتے ہو ۔
سجاد : قابلِ داد خوش فہمی ہے ۔ خیر اب بیٹھ جاؤ ۔ میں ضرور تمہارا خیر مقدم کروں گا
بہت دور سے آئے ہو ۔ چہرے پہ گرد و غبار چھایا ہے سینے پر ہاتھ رکھا
ہوا ہے ۔ خدانخواستہ اب دل میں بھی درد ہونے لگا ہے ۔
آصف : میری رگ رگ میں درد ہے
سجاد : یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے — خطرے کی بات ہے — بے حد خطرے
کی بات ہے ۔ دل کا درد تو انسان کو ایک منٹ میں ختم کر ڈالتا ہے اور
کر دیتا ہے ۔

آصف : (سنجیدگی کیساتھ) سجاد!

(پلٹ کر پروین کو دیکھتا ہے پھر سجاد پر اپنی نظریں جما دیتا ہے)

سجاد : (آصف کی طرف دیکھے بغیر) کیا ہے؟

آصف : (اپنی رو میں) بچپن سے لے کر اب تک تم فاتح رہے ہو — اور میں شکست خوردہ — مگر آج تمہیں شکست ہوئی ہے۔ پروین تمہاری نہیں، میری ہے۔ کیونکہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں تم نہیں، میں ہوں۔

سجاد : یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کرو کہ تمہارا دماغ بہت زیادہ خراب ہو چکا ہے (سجاد سگریٹ پرے پھینک دیتا ہے) میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمہاری حالت اتنی بگڑ جائے گی۔

آصف : میں تم سے نہیں پروین سے اس کا جواب سننے کے لیے آیا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے۔ درست ہے یا غلط ہے!

(سجاد خاموش ہو جاتا ہے۔ دو لمحے گزر جاتے ہیں)

سجاد : پروین! اگر یہ سچائی کا اظہار تمہیں سے سننا چاہتا ہے تو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔

(پروین دو تین لمحے خاموش رہتی ہے اور سامنے دیوار پر نگاہیں جمائے بے خیالی میں رومال بائیں ہاتھ کی انگلی کے گرد لپیٹتی رہتی ہے آصف اور سجاد — دونوں کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرتکز ہیں)

کہو پروین!

(پروین اسی طرح دیوار کو دیکھ رہی ہے)

پروین : کیا؟

آصف : پروین! خاموش کیوں ہو؟

پروین : معاملہ آپ دونوں کا ہے۔ میرا نہیں — میں دخل نہیں دے سکتی!

آصف : صرف تمہیں یہ فیصلہ کر سکتی ہو !

پروین : میں ایک بیاہتا عورت ہوں۔

آصف : اس وقت تم صرف ایک عورت ہو۔

(پروین دیوار سے نظریں ہٹا کر آصف کو دیکھتی ہے)

پروین : مجھے کچھ نہیں کہنا !

(پروین آصف کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سجاد کے چہرے پر بے چینی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور وہ ایک قدم آگے بڑھ کر پروین اور آصف کے درمیان آجاتا ہے)

سجاد : (غصّے سے) آصف! تم بہت آگے بڑھ گئے ہو۔ میں نے یہ سمجھ کر تمہارا پاس کیا ہے کہ تم پاگل ہو۔ اب میں یہ بیہودگی برداشت نہیں کروں گا۔

آصف : شکست کے تصور ہی سے پاگل ہوئے جا رہے ہو — ذرا اطمینان کرو۔ ابھی تمہاری فتح مندیوں کا محل زمین بوس ہوا جاتا ہے۔ حوصلے سے کام لو !

سجاد : اس نے جواب دے دیا ہے۔

آصف : کیا جواب دیا ہے ؟

سجاد : سنا نہیں تم نے — اس نے کہا نہیں میں ایک بیاہتا عورت ہوں۔ اب تم اس سے ایک لفظ تک بھی نہیں کہہ سکتے — ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ اب میرے اور تمہارے درمیان تمہارا پاگل پن حائل نہیں ہو سکتا۔ چلے جاؤ — فوراً — اسی لمحے !!

آصف : (مطمئن لہجے میں) سجاد! اگر میں تمہارے اس حربے سے خوفزدہ ہوتا تو یہاں کبھی نہ آتا۔

سجاد : میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا — تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔ جاؤ۔ نکل جاؤ۔ جاؤ۔

(سجاد آصف کو دھکا دیتا ہے۔ آصف دھکے سے پرے جا گرتا ہے۔ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور واپس آنے لگتا ہے)

آصف: یہ تمہاری شکست خوردہ ذہنیت کا پہلا اور آخری ہتھیار ہے۔ مگر آج یہ ہتھیار بالکل بے کار ہے۔ بزدلوں کی طرح بھیانک حقیقت سے راہِ فرار ڈھونڈ رہے ہو۔

سجاد: (آصف کی طرف بڑھتے ہوئے) خاموش کمینے!

آصف: میرے خاموش ہو جانے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔

(سجاد آگے بڑھ کر آصف کا گریبان پکڑ لیتا ہے)

سجاد: میں تمہارا خون پی لوں گا۔ بدمعاش!

(پروین آگے بڑھتی ہے)

پروین: ٹھہریئے!

(پروین ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے۔ اس کے چہرے پر کرب کے گہرے آثار پھیلے ہوئے ہیں! آصف بھی سجاد کا گریبان پکڑ لیتا ہے۔ پروین پہلے آصف کو اور پھر سجاد کو دیکھتی ہے)

چھوڑ دیجئے گریبان!

(دونوں پروین کو دیکھتے ہیں۔ مگر ان کے ہاتھ گریبانوں سے الگ نہیں ہوتے)

میں التجا کرتی ہوں، چھوڑ دیجئے ایک دوسرے کو۔ (آصف سے مخاطب ہوتی ہے) آصف!

(آصف اس کی طرف دیکھتا ہے)

—— شادی کے بعد اب میں تم سے اس قدر دور ہو چکی ہوں جس قدر آسمان کا ایک افق دوسرے افق سے دور ہوتا ہے۔

(آصف اپنے ہاتھ سجاد کے گریبان سے ہٹا دیتا ہے اور سجاد بھی اس
کا گریبان چھوڑ دیتا ہے)

آصف: آسمان اور افق — یہ سب کچھ محض فریبِ نظر ہے۔

(آصف ایک لمحے کے لیے رُکتا ہے اور پروین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کر کہتا ہے)

پروین! یہ شخص تمہارے ماں باپ کو فریب دے کر تمہیں لے آیا ہے۔ اس نے
اپنی چالاکی سے تمہارے پاؤں میں شادی کی زنجیریں ڈال دی ہیں۔ مگر تمہاری
روح بالکل آزاد ہے۔

(پروین خاموش رہتی ہے اور خلا میں گھورتی رہتی ہے)

آخر ڈرتی کس بات سے ہو۔ میں تمہارے مستقبل کی ساری ذمے داری اپنے ہاتھ
میں لیتا ہوں! — میں تمہاری ساری زندگی کا ذمے دار ہوں۔ ہر حالت میں —
— ہر قیمت پر۔ ہر انداز میں۔

پروین: (جیسے چونک کر) آصف!

(سجاد بڑی خونخوار نظروں سے آصف کو دیکھتا ہے)

آصف: تم آج سے ہر لمحہ مجھے سونپ سکتی ہو — میں ہر لمحے کو خوشیوں سے
بھر دوں گا!

سجاد: (غصے سے) پروین! یہ تماشا کیا ہے۔ کیوں نہیں سختی سے اسے ڈانٹ دیتیں؟
— دیکھ کیا رہی ہو؟

آصف: میں جانتا ہوں۔ پروین سچائی نہیں چھپائے گی۔ محبت کی سچائی عورت کا
سب سے بڑا سرمایہ ہے اور پروین محبت کی امانت دار ہے۔

(پروین کی نگاہیں خلا ہی میں پریشان ہیں)

پروین: سچائی!

آصف: تمہیں سچائی کا اظہار کر دینا چاہیئے!

(پروین چپ چاپ خلا میں گھورتی رہتی ہے)

سجاد (گرج کر) پروین!

(پروین بدستور خلا میں گھورتی رہتی ہے)

پروین: آصف!

(اب پروین جو کچھ کہے گی بڑے گہرے کرب آلود لہجے میں کہے گی)

تم نے جھیل کی لہروں میں چاند کی جھلک دیکھی اور پانی میں ہاتھ ڈال کر سمجھ لیا کہ چاند تمہارے قبضے میں آگیا ہے۔ اب اس کے مالک صرف تم ہو — تمہارے سوا کسی کو بھی اس پر کوئی حق نہیں ہے — اور

(پروین ایک لمحے کے لئے رک جاتی ہے۔ پھر سجاد کی طرف دیکھتی ہے)

حالات نے چاند کو تمہاری گود میں پھینک دیا تھا — تمہاری راتوں کا اندھیرا اس کی روشنی سے جگمگا سکتا تھا — تم اس وسیع دنیا کے کسی گوشے میں بھی چلے جاتے، زندگی کی کسی بھی منزل پہ پہنچ جاتے، یہ روشنی تمہارے ساتھ ساتھ رہتی، تمہارے ساتھ ساتھ چلتی تمہارے لیے ہر تاریکی ہر آندھی کا مقابلہ کرتی۔

(پروین کی آواز پہلے سے زیادہ کرب ناک ہو جاتی ہے)

مگر تم نے اپنی بدگمانی کی چھری سے اس چاند کا سینہ چیر ڈالا — تاکہ یہ معلوم کر سکو کہ اس کے نہاں خانوں میں کیا چھپا ہوا ہے — تم نے اس باہمی اعتماد کو پامال کر دیا ہے — جسے تمہاری بیوی اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا کر تمہارے گھر بس آئی تھی! — تمہارے گھر میں جسے اب وہ آخری سانس

تک اپنا گھر سمجھتی تھی۔

(پروین ذرا رُکتی ہے۔ اور جب بولتی ہے تو اس کی آواز بھرائی ہوئی ہے
اور یہ آواز کی کیفیت تیزی سے بڑھتی چلی جاتی ہے)

تم دونوں نے ایک عورت کی توہین کی ہے۔ ایک بیوی پر ظلم کیا ہے — اپنی فتح اور شکست کے پردے میں اسے اپنے انتقام اور بے اعتمادی کا نشانہ بنا دیا ہے۔

(ذرا رُکتی ہے)

سچائی معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو — عورت جس چیز کو اپنا قیمتی راز سمجھتی ہے۔ اسے اپنے دل کے بے کراں سناٹوں میں دفن کر دیتی ہے — اس کے اردگرد اپنی روح کے تقدس کی دیواریں کھڑی کر دیتی ہے — جنہیں اس کی نگاہیں بھی نہیں چھو سکتیں، جہاں تک اس کے اپنے آنسو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

(پروین آخری بار رکتی ہے)

میرے سینے کی گہرائیوں میں جو تاج محل جگمگا رہا ہے اس میں اس شخص کی زندہ محبت مدفون ہے جو مدت ہوئی اس دنیا سے چلا گیا تھا۔ اور جس کا نام سلیم تھا!

(آخری فقرہ کہتے ہی پروین اپنی آنکھوں پہ دایاں ہاتھ رکھ کر تیزی سے برآمدے والے دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔ سجاد اور آصف حیران و ششدر دروازے کو دیکھ رہے ہیں۔ اسی عالم میں پردہ گرتا ہے)

آقائے ولی نعمت

کردار

آقائے ولی نعمت

ملکہ

وزیر اعظم

حاجب

چار حکیم

خادمہ

آغا ہے دلی نعمت کے محل کا ایک حصہ — ہر چیز سے شاہانہ عظمت وجلال نمایاں۔ فرش پر نہایت اعلیٰ، دبیز اور رنگارنگ قالین اور غالیچے۔ اور پر سنہری صوفے، کوچ اور کرسیاں۔ بڑے بڑے فانوس چھت سے آویزاں — دائیں بائیں جانب خوبصورت رنگین اور ریشمی پردوں کے پیچھے دو دروازے۔ دائیں جانب کا دروازہ شاہی خاندان کے لیے مخصوص اور بائیں طرف کا دوسرے لوگوں کے لیے مستعمل — وسط میں ایک ستون جس پر سونے کی موٹی تہہ جمی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے اس سے چند لمحوں کے بعد ملکہ دروازے میں سے اندر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں — ملکہ شاہانہ مگر بہت حد تک یورپی لباس میں ملبوس ہیں۔ عمر پچیس اور تیس کے درمیان۔ رنگ بے عیب سفید، چہرے کے خدوخال بڑے دلکش، اور موزوں۔ البتہ ناک دوسرے خدوخال کی بہ نسبت ذرا بڑی ہے۔ سر پر چھوٹا سا تاج جس میں مختلف رنگ اور وضع قطع کے ہیرے

دمک رہے ہیں۔

ملکہ کے بڑے بڑے سیاہ چمکیلے بال اس کی خوبصورتی میں اچھا خاصا اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ بال بلندی سے گرتے ہوئے آبشار کی طرح اسکے سینے اور بازوؤں پہ لہرا رہے ہیں ۔۔ اس وقت ملکہ کے چہرے پر غم و اندوہ کا گہرا سایہ چھایا ہوا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی ستون کے پاس آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ دایاں ہاتھ ستون پہ رکھ دیتی ہیں جیسے سہارا لے رہی ہوں۔ بائیں ہاتھ سے سینے پہ بکھرے ہوئے بالوں کا ایک حصہ پکڑ لیتی ہیں۔ بالوں کو دیکھتی ہیں اور پھر بال ہاتھ سے جھٹک کر آنکھیں بند کر کے فرطِ مایوسی میں سر ستون سے لگا دیتی ہیں

دروازے سے ایک خادمہ آتی ہے جس نے طشت میں شربت کا گلاس اٹھا رکھا ہے ۔۔ خادمہ مؤدبانہ انداز سے آگے بڑھتی ہے اور ملکہ کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ملکہ آنکھیں کھول دیتی ہیں، اسے دیکھتی ہیں اور ہاتھ اٹھا کر اُسے جانے کا اشارہ کرتی ہیں۔ خادمہ دروازے کی طرف پُشت کیے جانے لگتی ہے۔ ملکہ سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی ہیں ۔۔ اسی عالم میں تین چار لمحے گزر جاتے ہیں۔

دروازے کا پردہ ہٹا کر آقائے ولی نعمت آتے ہیں۔

آقائے ولی نعمت کی صحت بڑی اچھی ہے عمر چالیس کے لگ بھگ ملکہ کے مقابلے میں ذرا سانولا، لباس شاہانہ، سر پہ تاج جو ملکہ کے تاج سے بڑا ہے۔ ملکہ کو ان کے آنے کی بالکل خبر نہیں ہوتی ۔۔ اپنے خیالات ہی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ آقائے ولی نعمت ۔۔ آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ ان کے بائیں شانے پہ رکھ دیتے ہیں۔ ملکہ چونک سی پڑتی

ہیں اور جب اپنے سامنے آقائے ولی نعمت کو دیکھتی ہیں تو ان کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آجاتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسکراہٹ
آئی نہیں لائی گئی ہے۔ پھیکی، افسردہ اور بے رنگ۔

آقائے ولی نعمت : (ملکہ کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے) ملکہ!

ملکہ : جی آقائے ولی نعمت!

آقائے ولی نعمت : تمہیں اپنے قریب نہ پاکر ہم پریشان ہو گئے تھے۔

ملکہ : آپ امورِ سلطنت میں مشغول تھے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے آپ کے
سامنے سے ہٹ جاؤں تاکہ آپ اطمینان کے ساتھ مصروف رہیں!—

آقائے ولی نعمت :۔ (ذرا خاموش رہ کر) امورِ سلطنت! پناہ بخدا، ہمارے لیے اور سارے
ملک کے لیے صرف یہی ایک مسئلہ باقی رہ گیا ہے جسے سنتے سنتے ہمارے کان بیزار
ہو گئے ہیں۔

ملکہ :۔ میں جانتی ہوں!

(ملکہ آہ بھرتی ہیں)

آقائے ولی نعمت : معلوم یوں ہوتا ہے اس سے بڑا مسئلہ نہ آج تک پیدا ہوا ہے اور نہ
کبھی پیدا ہو گا!

ملکہ : سب درباریوں پر اس طرح اضطراب چھا گیا ہے جیسے سمندر میں طوفان برپا ہو
جائے۔

آقائے ولی نعمت : (اپنا بازو ملکہ کی گردن میں حائل کر کے) حالات کچھ بھی ہو جائیں ہمارے دلوں
کی خوشیاں زندہ اور سلامت رہیں گی (بڑے پیار سے ملکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر)
ملکہ! جانِ شیریں۔

ملکہ : جی!— فرمایئے!

آقائے ولی نعمت :- تم ہماری سلطنت ہی کی نہیں ہمارے دل کی ملکہ بھی ہو۔

ملکہ :- مگر! — (آواز بھرا جاتی ہے۔ آگے کچھ نہیں کہہ سکتیں بے اختیار اپنا سر آقائے ولی نعمت کے سینے سے لگا دیتی ہیں۔) — مگر!

آقائے ولی نعمت : کوئی فکر نہ کرو۔ یہ (انگلی سے ملکہ کے تاج کی طرف اشارہ کر کے) یہ تاج تمہارا رہے نہ رہے (اپنے دل کی طرف اشارہ کر کے) یہ دل ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا!

ملکہ :- مجھ بدقسمت کے بال —

(ملکہ سر اٹھاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں)

آقائے ولی نعمت : ملکہ! (شاہانہ جلال میں) ہم جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا رویہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا! — ہم اس ملک کے آقائے ولی نعمت ہیں اور آقائے ولی نعمت کا ہر حکم کوہ بے ستون سے بھی زیادہ سنگین ہوتا ہے۔

ملکہ : ظلِ ہما! — (سر جھکا لیتی ہیں)

آقائے ولی نعمت :- ملکہ!

ملکہ :- آپ اس وسیع ملک کے آقائے ولی نعمت ہیں اور میں ملکہ — کاش ہم معمولی انسان ہوتے!

آقائے ولی نعمت : ایسا کیوں۔ ملکہ ایسا کیوں؟

ملکہ :- اوہ! معاف کیجئے۔ یہ بات میں نے یونہی کہہ دی ہے آقائے ولی نعمت!

آقائے ولی نعمت : تم نے اس طرح سوچا ہی کیوں ہے؟

ملکہ : یونہی!

آقائے ولی نعمت :- یونہی؟

ملکہ : سوچتی ہوں اگر ہم عام انسان ہوتے تو یہ فصیل ہماری محبت میں کسی وقت بھی حائل نہ ہوتی — ہم نہایت مسرور زندگی بسر کرتے۔ مگر آج!

آقائے ولی نعمت: ملکہ!

ملکہ: (انگلیوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے) یہاں آنے سے پہلے میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے نیچے دیکھا تھا۔ وہاں دھوبی اور دھوبن بڑی بے فکری سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں۔ کتنی آزادی سے ہنستے ہیں۔ انہیں کسی بات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ان کی غریبی ہی ان کے لئے نعمت بن گئی ہے۔ ہمیں شاہانہ جاہ و جلال حاصل ہے۔ لاکھوں لوگ ہمارے راستے میں اپنی آنکھیں بچھاتے ہیں۔ مگر آج ہماری سبھی خوشیاں خطرے میں ہیں۔ اوہ! آقائے ولی نعمت! (پھر اپنا سر ان کے سینے سے لگا دیتی ہیں) معاف کر دیجئے میں اپنے حق سے تجاوز کر گئی ہوں۔ اوہ میرے آقا!

(ملکہ کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں)

آقائے ولی نعمت: ملکہ! تمہاری یہ حالت دیکھ کر ہمارے دل میں نشتر سے چبھنے لگے ہیں۔

(بہت مغموم ہو جاتے ہیں)

ملکہ: مجھے بہت ندامت ہے۔

آقائے ولی نعمت: (ملکہ کا سر بھینچتے ہوئے) ہماری ملکہ کو نادم ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم زندہ ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا کیا فرض ہے اور ہمیں اپنی پیاری ملکہ کے لئے کیا کرنا چاہیئے!

ملکہ: مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری خوشیوں کے آفتاب پر سیاہ کثیف بادل چھا رہے ہیں۔

آقائے ولی نعمت: ملکہ! مایوس کیوں ہوتی ہو۔ تمہیں اس طرح مایوس نہیں ہونا چاہیئے ابھی ابھی وزیرِ اعظم نے بتایا ہے کہ آج چار شہرۂ آفاق حکیم آ رہے ہیں۔

ملکہ :- (لہجے میں مایوسی) حکیم تو پہلے بھی آتے رہے ہیں

آقائے ولی نعمت :- مگر یہ حکیم دنیا کے بڑے دانشور ہیں اور ناممکن کو ممکن بنا دینا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

ملکہ : اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو — تو کیا ہوگا ؟

آقائے ولی نعمت : اگر ایسا نہ ہو سکا تو — تو ہم سب کچھ چھوڑ دیں گے مگر اپنی شیریں ادا ملکہ کو نہیں چھوڑیں گے۔

ملکہ :- ایسا نہ کہئے حضور ! — ایسا نہ کہئے۔

آقائے ولی نعمت :- جہاں تم ہو وہاں ہم ہیں — جہاں ہم ہیں وہاں تم ہو۔

(دروازے پر خادمہ آتی ہے اور نگاہیں فرش پر جائے کھڑی ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے ملکہ کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ وہ اپنا ہاتھ دونوں رخساروں پر پھیرتی ہیں ملکہ کا رخ دروازے کی طرف ہے۔ آقائے ولی نعمت بھی دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ خادمہ کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں خادمہ کی طرف دیکھے بغیر)

کیا ہے ؟

خادمہ :- (بدستور نظریں جھکائے) وزیرِ اعظم آقائے ولی نعمت کی خدمت میں حاضر ہونے کے آرزومند ہیں

آقائے ولی نعمت : اس وقت نہیں !

(خادمہ چلی جاتی ہے)

وہی بات ہوگی - اور کیا کہے گا یہ پیر فرتوت

(خادمہ دوبارہ آتی ہے اور اسی انداز میں کھڑی ہو جاتی ہے)

تم پھر آگئیں ؟

خادمہ: وزیر اعظم فرماتے ہیں معاملہ بہت اہم ہے۔

آقائے ولی نعمت:۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں (ہاتھ ہوا میں لہرا کر) جاؤ!

(خادمہ اسی مودبانہ انداز سے چلی جاتی ہے)

ملکہ: آقائے ولی نعمت! وزیر اعظم کو شرف باریابی بخش دیں!

آقائے ولی نعمت: اس وقت ہم اپنی جان سے پیاری ملکہ کے پاس ہیں اور جب ہم ملکہ کے پاس ہوں تو کسی اور کو پاس آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

ملکہ: مگر امورِ سلطنت!۔۔۔ آپ آقائے ولی نعمت ہیں جہاں پناہ!

(دروازے پر وزیرِ اعظم آتے ہیں۔ وزیرِ اعظم کی شکل باتصویر چھپی ہوئی الف لیلیٰ کے پیرِ تسمہ پا سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔ ڈاڑھی بھی سفید براق، سر پر عمامہ، جسم ٹخنوں تک لبادے میں چھپا ہوا۔ ہاتھ میں لپٹا ہوا ایک لمبا کاغذ۔۔۔ آقائے ولی نعمت اور ملکہ۔۔۔ دونوں ادھر دیکھتے ہیں۔ آقائے ولی نعمت کی پیشانی شکن آلود ہو گئی ہے۔)

وزیرِ اعظم:۔ (مودبانہ سر جھکا کر) یہ بندۂ ناچیز اپنے آقائے ولی نعمت سے اس گستاخی کے لئے بصد ندامت معافی مانگتا ہے۔

آقائے ولی نعمت:۔ (لہجے میں کرختگی) مداخلت کی وجہ؟

وزیرِ اعظم:۔ بندگانِ عالی! یہ معاملہ سلطنت کے لئے نہایت اہم ہے اور اس پر ہمارے عظیم الشان ملک کے جاہ و جلال کا انحصار ہے حضور!

آقائے ولی نعمت: (بیزاری سے) یہ الفاظ تم پہلے ہی ایک ہزار ایک مرتبہ کہہ چکے ہو۔

وزیرِ اعظم: عالی جاہ! حضور کے نمک خواروں کے لئے اس سے زیادہ اہم معاملہ اور کوئی نہیں ہے۔

آقائے ولی نعمت:۔ یہ بات تم کم از کم ایک ہزار ایک سو بار سنا چکے ہو۔
وزیر اعظم:۔ جہاں پناہ کیا کروں۔ میری وفاداری کا یہی تقاضا ہے۔
آقائے ولی نعمت:۔ (کانوں پہ ہاتھ رکھ کر) یہ بات کم و بیش —— کیا دنیا جہان کی سب باتیں ختم ہو چکی ہیں۔ کہنے کے لئے اور کچھ بھی باقی نہیں رہا؟
وزیر اعظم:۔ آقائے ولی نعمت! (کاغذ کھولتے ہوئے) جیسا کہ حضور پر نور کے گوش گزار کر چکا ہوں آقائے ولی نعمت کے تمام نمک خوار سخت مضطرب ہیں بلکہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ ان وفا کیشانِ ازلی نے دنیا کے ایسے چار حکیموں کو طلب کیا ہے جو اپنے فن میں شہرۂ آفاق ہیں (کاغذ پر نظریں جما کر) ان میں سے ایک وادیٔ شمال کا مسلم الثبوت حکیم ہے۔ دوسرا کشورِ مشرق کا فخرِ روزگار معالج ہے۔ تیسرا دیارِ مغرب کا مشہورِ عالم طبیب ہے۔ اور چوتھا جزیرہ جنوب کا استاذ الحکماء ہے۔ (کاغذ لپیٹتے ہوئے) یہ لوگ دروازے کے باہر فرمانِ شاہی کے منتظر کھڑے ہیں۔
آقائے ولی نعمت: ہماری ملکہ پسند کریں تو انہیں شرفِ باریابی بخشا جا سکتا ہے۔

(آقائے ولی نعمت ملکہ کو دیکھتے ہیں جو خاموش کھڑی رہتی ہے)

وزیر اعظم: غلام کے کان ملکہ عالیہ کے الفاظ سننے کے لئے بے تاب ہیں!
ملکہ: میری ہر رضا آقائے ولی نعمت کی مرضی کی پابند ہے۔
آقائے ولی نعمت: نہیں ایسا نہیں، ہماری ہر خواہش ہماری ملکہ کی رضامندی کے سوا کچھ بھی نہیں!
ملکہ: (آقائے ولی نعمت سے) آپ حکم دیں!
آقائے ولی نعمت:۔ نہیں تم جو حکم چاہو دو۔

ملکہ: حضور آپ ہی فرمائیں!

آقائے ولی نعمت:۔ عزیز از جان ملکہ! ہمیں تو ہر معاملے میں تمہاری خواہش کا احترام کرنا ہے۔ تم جو کچھ چاہو گی وہی ہمیں بطیبِ خاطر منظور ہوگا!

(وزیرِ اعظم بڑے غور سے انہیں دیکھ رہے ہیں اور مضطرب ہو رہے ہیں۔ پٹا ہوا کاغذ بغل میں داب کر تالیاں بجاتے ہیں۔ خادمہ آتی ہے۔ وزیرِ اعظم دایاں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہیں اور پھر کاغذ بغل سے نکال کر ہاتھ میں لے لیتے ہیں — خادمہ چلی جاتی ہے۔)

حاجب:۔ (دروازے کے باہر سے) وادیٔ شمال کے مسلم الثبوت حکیم حاضرِ خدمت ہوتے ہیں۔

(خادمہ پردہ ہٹاتی ہے۔ وادیٔ شمال کے حکیم اندر آتے ہیں — فربہ اندام۔ ٹخنوں تک ایک لمبا کرتا پہنے ہوئے ہاتھ میں ایک بڑا سا محدب شیشہ۔)

وزیرِ اعظم:۔ (وادیٔ شمال کے حکیم سے مخاطب ہو کر) خوش آمدید! (حکیم ادب سے سر جھکاتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں۔ ملکہ کے پاس پہنچ کر محدب شیشے میں سے ملکہ کے بازو پر پھیلے ہوئے بالوں کو غور سے دیکھتے ہیں۔ چند لمحے گزر جاتے ہیں پھر شیشہ ہٹا لیتے ہیں اور پہلے کی طرح ادب سے سر جھکا کر واپس دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ خادمہ پردہ ہٹا دیتی ہے۔ حکیم باہر نکل جاتے ہیں۔)

حاجب:۔ (باہر سے) کشورِ مشرق کے فخرِ روزگار معالج بارگاہ عالیہ میں حاضر ہوتے ہیں۔

(خادمہ پردہ ہٹاتی ہے۔ ایک ٹھنگنے قد کے بوڑھے معالج جنہوں نے چغہ پہن رکھا ہے اور سر پہ عمامہ ہے — دروازے پر آتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیالہ ہے جس میں کوئی سیال چیز

چمک رہی ہے۔)

وزیرِ اعظم :۔ (معالج سے) خوش آمدید!

(معالج ادب سے سر جھکا کر اور ہر قدم پر تعظیماً آہستہ آہستہ آگے آتے ہیں۔ ملکہ کے پاس پہنچتے ہیں اور پیالہ ان کے بالوں کے اس قدر قریب لے جاتے ہیں کہ بالوں کا عکس سیال چیز پہ پڑنے لگتا ہے — دو تین لمحے گزر جاتے ہیں — معالج پیالہ ہٹا کر، سر جھکا کر دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ خادمہ پردہ ہٹا دیتی ہے اور وہ دروازے میں سے نکل جاتے ہیں۔)

حاجب : (باہر سے) دیارِ مغرب کے مشہورِ عالم طبیب شرف بازیابی حاصل کرتے ہیں۔

(خادمہ پردہ ہٹاتی ہے۔ ایک بوڑھا جس کی شکل "انکل سام" جیسی ہے اور جس کے ہاتھ میں دوربین ہے — دروازے پر آتا ہے)۔

وزیرِ اعظم :۔ (طبیب کی طرف دیکھ کر) خوش آمدید!

(طبیب ذرا مسکراتے ہیں — ملکہ کے پاس جا کر دوربین سے ان کے بال دیکھتے ہیں اور پھر تیزی سے واپس جانے لگتے ہیں۔)

حاجب :۔ (بدستورِ سابق باہر سے) جزیرہ جنوب کے استاذ الحکماء حاضر ہوتے ہیں۔

(دروازے کا پردہ ہٹائے جانے پر ایک لحیم و شحیم بزرگ جوگیوں ایسا لباس پہنے اور ہاتھ میں جڑی بوٹیاں لئے ہوئے آتے ہیں۔)

وزیرِ اعظم : (حکیم سے مخاطب ہو کر) خوش آمدید!

(— حکیم آگے بڑھ کر جڑی بوٹیاں ملکہ کے شانے پر بکھرے ہوئے بالوں میں لگاتے ہیں اور پھر بڑے غور سے بالوں کو دیکھتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں — وزیرِ اعظم خادمہ کو اشارہ کرتے ہیں — خادمہ

حکیم کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی جانب لگتی ہے۔

حکیم آنکھیں کھول کر دروازے میں سے نکل جاتے ہیں۔ ان کے

پیچھے وزیر اعظم بھی چلے جاتے ہیں۔

ملکہ یوں نظر آتی ہیں جیسے صدمے سے نڈھال ہوں — وہ دروازے

کی جانب دیکھ رہی ہیں۔ آقائے ولی نعمت ملکہ پر نگاہ ڈالتے ہیں

مگر اس سے پیشتر کہ کچھ کہیں وزیر اعظم دروازے پر آتے ہیں۔

اس وقت ان کا چہرہ بڑا مایوس دکھائی دیتا ہے۔ ہاتھ میں

کاغذ کی بجائے اب سیاہ رومال ہے۔ وزیر اعظم لمبی آہ بھرتے

ہیں اور آہستہ آہستہ آقائے ولی نعمت اور ملکہ کی طرف قدم

اٹھاتے ہیں اور ان سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک جاتے ہیں۔

بار بار آنکھیں جھپکاتے ہیں۔ سیاہ رومال سے آنکھیں پونچھتے

ہیں۔)

وزیر اعظم: یہ خاکسار وفا شعار آقائے ولی نعمت اور ملکہ عالیہ کے

لئے ایک دردناک خبر لے کر آیا ہے۔

(— ملکہ کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے وہ ستون پر ہاتھ رکھ

دیتی ہیں۔ آقائے ولی نعمت کا چہرہ اور مغموم ہو جاتا ہے۔)

دنیا کے ان چاروں جلیل القدر حکیموں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حضور ملکہ عالیہ کے سیاہ

بال سنہری نہیں ہو سکتے

(وزیر اعظم پھر آنکھیں تیزی سے جھپکاتے ہیں اور ان پر رومال

اس طرح پھیرتے ہیں جیسے آنسو خشک کر رہے ہوں)۔

تمام رعایا اور خانوادۂ شاہی کے نمک خواروں کو اس خبر سے بہت صدمہ پہنچا

ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے جیسے ہم پر آسمان سے بجلی آگری ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ اس وقت سوال اس عظیم الشان سلطنت کے جاہ و جلال کا ہے اس جاہ و جلال کا تقاضا یہ ہے کہ سلطنت کی ملکہ کے بال سورج کی شعاعوں کی طرح سنہری ہوں — لیکن ہماری قابلِ صد احترام اور مقدس ملکہ کے نہایت خوبصورت بال صرف اسی خصوصیت سے محروم ہیں — (ذرا رک کر) آقائے ولی نعمت کو شہنشاہی روایات کی پابندی کرتے ہوئے ایک سنہری بالوں والی عورت کو ملکہ بنانا ہوگا (ذرا رک کر اور ان کے زیادہ قریب آکر) آج سلطنت کا ننگ و ناموس، ملکی قانون اور اس قدیم محل کی عظمت ملکہ عالی وقار اور آقائے ولی نعمت سے محبت کی قربانی چاہتی ہے!

ملکہ:۔ (آقائے ولی نعمت سے کمزور اور مضمحل آواز میں) مجھے معاف کر دیجئے آقا!

آقائے ولی نعمت: (ملکہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) ملکہ!

ملکہ: میرے آقا! سلطنت اور شہنشاہیت کے لئے محبت کی قربانی ضروری ہے!

آقائے ولی نعمت:۔ مگر — میں کیا کروں گا!

ملکہ: آپ — میرے آقا!

(ملکہ بے اختیاری کے عالم میں اپنا سر آقائے ولی نعمت کے سینے سے لگا دیتی ہیں — چند لمحوں کے لئے سناٹا چھا جاتا ہے — ملکہ ضبط کر کے سر ہٹاتی ہیں) اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا!

آقائے ولی نعمت: ہماری عزیز رعایا ہماری محبت کی قربانی مانگتی ہے تو ہمیں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

ملکہ: خدا آپ کو اور مجھے صبرِ جمیل عطا فرمائے!

(ملکہ سر سے تاج ہٹانے لگتی ہیں)

وزیرِ اعظم: (ملکہ سے) شاد باد اے باوقار قوم کی دخترِ باوقار! آپ کی یہ عظیم الشان قربانی ہمارے ملک کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی - اور آنے والی نسلیں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا کریں گی! (آقائے ولی نعمت سے) اے ایثار پیشہ آقائے ولی نعمت! آپ نے اپنی قربانی سے ثابت کر دیا ہے کہ شہنشاہی روایات کے سامنے انسانی مسرتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے - زندہ باد آقائے ولی نعمت، پائندہ باد ملکہ!

(ملکہ تاج سر سے اتار چکی ہیں — تاج ان کے
ہاتھ میں ہے کہ پردہ تیزی سے گرتا ہے)

دروازہ

کردار

بوڑھا		ظہوری	
مسافر		لیڈر	
عورت	مسافر کی بیوی	آفاقی	
لڑکا		بڑی بیگم	"اسوا" کی نائب صدر
ایک بزرگ		آپا جان	"اسوا" کی صدر
ایک آدمی	ہوٹل کا منیجر	ساری پوش	
حاکم اعلیٰ		غرارہ پوش	
رضوی	حاکم اعلیٰ کا سکریٹری	رضیہ	
سیٹھ صاحب		منشی	

تیسرے منظر کو معمولی تبدیلیوں کے بعد چوتھا، پانچواں اور چھٹا منظر بنایا جا سکتا ہے

ایک صبح، نو دس کا عالم

سٹیج ایک ایسے مقام کا منظر پیش کرتی ہے۔ جہاں ایک بہت بڑے دروازے کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

یہ دروازہ تماشائیوں کے عین سامنے سٹیج کے آخری حصے میں دکھائی دے رہا ہے۔ دروازے کے آگے جگہ بالکل خالی ہے اور دروازہ اندر سے بند ہے۔

دروازے کے دائیں بائیں دو الگ الگ راستے جاتے ہیں جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ سٹیج خالی ہوتی ہے۔ دو تین لمحوں کے بعد بائیں جانب سے ایک آدمی دروازے کی طرف آتا ہے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اسے دیکھتا ہے، اپنا دایاں ہاتھ اُس پر رکھ دیتا ہے۔ پھر جدھر سے آیا ہے ادھر منہ پھیر کے ایک لمبا سانس لے کر کہتا ہے۔

آواز میں گہری بے تابی ہے۔

"بابا۔ بابا"

مسافر بے تابی سے ادھر دیکھتا رہتا ہے۔ ایک عورت دس گیارہ سال

کے لڑکے کی انگلی پکڑے آتی ہے۔ عورت کے پیچھے ایک بوڑھا آدمی آتا ہے۔
نحیف و نزار خمیدہ کمر ہاتھ میں لاٹھی!
چاروں کا لباس میلا کچیلا اور چہرے گرد آلود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہیں بہت دور
سے آئے ہیں۔ اور بہت تھکے ہوئے ہیں چاروں دروازے کے سامنے کھڑے ہو
کر اسے بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگتے ہیں)

بوڑھا: یہی نئے شہر کا دروازہ ہے

مسافر: ہاں بابا!

لڑکا: ہم نئے شہر میں آگئے ابا!

مسافر: اسی دروازے کے پیچھے وہ نیا شہر آباد ہے۔

بوڑھا: (آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر) خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہم منزل پر
پہنچ گئے!

عورت: پر یہ بند کیوں ہے؟

مسافر: انھیں کیا خبر کہ ہم یہاں آپہنچے ہیں۔ جب انھیں معلوم ہوگا کھل جائے گا۔

لڑکا: کب کھلے گا؟

عورت: زور سے آواز دو منیر کے ابا!

مسافر: دستک دیتا ہوں۔

عورت: جلدی کرو، ہمارا برا حال ہے۔

(دروازے پر دستک دیتا ہے۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھل جاتا ہے دروازہ
کھلتے ہی دور سے آتی ہوئی موسیقی کی لہریں فضا میں تیرنے لگتی ہیں۔ یہ موسیقی
بڑی دلنواز اور وجد آور ہے دروازے پر ایک ایسا آدمی آتا ہے۔ جو
بڑا مدبر، شفیق اور بارعب معلوم ہوتا ہے۔ چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ

لباس نہایت شاندار اور بیش قیمت۔ سر پہ قراقلی ٹوپی، بزرگ مسافروں کو دیکھتے ہی محبت سے اپنے بازو پھیلا دیتا ہے۔ فرطِ اشتیاق سے تھرتھراتی ہوئی آوازیں کہتا ہے "آ گئے میرے بچو!" یہ کہتے ہوئے سب سے پہلے ـــــ مرد سے بغل گیر ہوتا ہے۔ پھر لڑکے کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے اور ساتھ ہی کہتا ہے "ہمیشہ خوش رہو" عورت کے سر پہ ہاتھ رکھ کر "جیتی رہو میری بچی" کہتا ہے۔ اور بوڑھے سے ہاتھ ملاتا ہے "خوش آمدید! میرے بھائی!" کے الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلتے ہیں۔

مسافروں کے چہرے شگفتہ ہو گئے ہیں۔ اور وہ نووارد بزرگ کو بڑے احترام کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔

بزرگ : میں نے تمہارا بڑا انتظار کیا ہے!

مرد : سفر اتنا لمبا اور کٹھن تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا!

بوڑھا : ہمارے جسم تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکے ہیں۔ پاؤں چلتے چلتے زخمی ہو گئے ہیں بھوک پیاس سے بہت بُرا حال ہے۔

مرد : اگر نئے شہر میں پہنچنے کا شوق ہمارے دلوں میں نہ ہوتا تو ہم یہاں تک پہنچتے پہنچتے ضرور مر کھپ گئے ہوتے!

عورت : ہمارے پاس جتنا زادِ راہ تھا سب کا سب ختم ہو گیا ہے۔

بوڑھا : اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا سب کچھ کھو چکے ہیں۔

بزرگ : تم نے جو کچھ کھویا ہے اور جتنے صدمے اٹھائے ہیں اُن کا مجھے پورا پورا علم ہے لیکن اب اپنی ساری مصیبتیں بھول جاؤ تمہاری دکھوں کی کالی رات بیت گئی ہے۔ اور خوشیوں کی تابناک صبح طلوع ہو چکی ہے اس دروازے کے ادھر جو عظیم

شہر آباد ہے وہ تمہارے — اور فقط تمہارے لیے ہے اس شہر کے دریا چاندی بکھیرتے ہیں اور زمین سونا اگلتی ہے۔ یہاں کے باغات، مکانات، ہری بھری کھیتیاں، کارخانے درس گاہیں اور اناج کے ذخیرے۔ سب کچھ تم غریبوں کے لیے ہے یہاں جو ملازمت یا جو کام چاہو کر سکتے ہو۔ کسی قسم کی بندش یا قید نہیں ہے تمہارے اس شہر میں کوئی امیر آدمی کسی غریب پر ظلم نہیں کر سکتا۔ کسی کو بھی کسی سے کچھ چھین لینے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں سب رہنے والوں کو زندگی کی ہر ضروری چیز ہر وقت مل سکتی ہے۔ اور بآسانی مل سکتی ہے۔

(مسافر اور اس کے ساتھی ہمہ تن چشم بزرگ کو دیکھ رہے ہیں)

اس مقدس شہر میں دغا، فریب، رشوت، حق تلفی، لوٹ کھسوٹ اور اس قسم کی تمام برائیوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

(بزرگ مسافروں کو اندر جانے کا اشارہ کرتا ہے)

جاؤ اس جنت میں داخل ہو جاؤ۔ جاؤ محبت، عزت اور مسرت کی بھرپور زندگی بسر کرو — جاؤ — میرے بچو! جاؤ۔ (مسافر دروازے کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

منظر بدلتا ہے

(جب دوبارہ پردہ اٹھتا ہے۔ تو ہم سٹیج پر ایک سجا سجایا کمرہ دیکھتے ہیں۔ فرش پر دری اور اس کے اوپر پلنگ، کرسیاں، میز، صوفہ سیٹ اور سنگار میز۔ سارا فرنیچر بڑے قرینے سے رکھا گیا ہے۔ مسافر، عورت اور بوڑھا کمرے کے وسط میں کرسیوں پر

بیٹھے ہیں۔ میز پر چائے کے خالی برتن اور چند پلیٹیں پڑی ہیں
جن میں روٹی کے بچے کچھے ٹکڑے پڑے ہیں۔
مسافر آخری گھونٹ پی کر، پیالی میز پر دوبارہ رکھتے ہوئے
اپنی جگہ سے اٹھتا ہے، سنگار میز کے پاس جاتا ہے۔ اسے
غور سے دیکھنے لگتا ہے، عورت بھی اس کے پاس پہنچ جاتی
ہے، دونوں پیار بھری نظریں ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں)

مسافر :۔ اب تو بڑی خوش ہو ناں!

عورت :۔ سچ مچ جنت میں آگئے ہیں، کتنا پیارا اور شاندار گھر ہے۔ (دونوں کھڑکی میں باہر دیکھنے لگتے ہیں)

مسافر :۔ بزرگ نے بالکل سچ کہا تھا۔ ہم اپنی جنت میں آگئے ہیں۔

عورت : یہاں کے مکان، باغ اور کھیت کتنے اچھے ہیں۔ سڑکیں کیسی صاف ستھری ہیں، کتنی عجیب عجیب موٹریں اور دکانیں ہیں۔ ہر دکان عجیب گھر ہے۔

مسافر : اور جگہ جگہ کھیل تماشے۔ میں تو سچ مچ ہی جنت میں آگیا ہوں۔

عورت :۔ ہم اپنے منیر کو کسی بڑے اچھے سکول میں داخل کرادیں گے۔ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے گا۔

مسافر : میں نے بھی تو یہی بات سوچی ہے۔ ہمارا منیر لائق فائق ہو جائے گا۔ بڑا افسر بن جائے گا۔ میں یہاں کلرکی نہیں کروں گا — تجارت کرونگا!

عورت : اور تم نے دیکھا یہاں کے لوگ کتنی محبت سے پیش آتے ہیں جب تم نے ایک شخص سے کہا ہم بڑی دور سے آئے ہیں تو وہ بیچارہ ہمیں خود یہاں لے آیا —
(مسافر کچھ سوچ رہا ہے، عورت اسے غور سے دیکھتی ہے)

عورت : منیر کے ابا۔ میں نے کہا — کیا سوچ رہے ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ منیر

کے ابا!

مسافر:۔ کیا کہا؟

عورت: تم سوچ کیا رہے ہو؟

مسافر: سوچ رہا ہوں ہم نے یہاں آنے سے پہلے کتنے دکھ اٹھائے ہیں — کتنی سختیاں جھیلی ہیں! کیسے کٹھن راستوں اور خارزروں سے گزرے ہیں۔ ان کی یاد ہی پریشان کر دیتی ہے۔

عورت: اب وہ زمانہ بھول جاؤ منیر کے ابا۔ تمہیں یاد نہیں رہا۔ بزرگ نے کہا تھا۔ تمہاری دکھوں کی کالی رات بیت گئی اور خوشیوں کی صبح آگئی اب تو خوشی ہی خوشی ہے۔

مسافر: یونہی خیال آگیا تھا۔

عورت:۔ اب یونہی خیال بھی نہیں آنا چاہیئے۔ ہم نے جو کچھ کھویا ہے۔ اس سے زیادہ پالیا ہے۔

مسافر:۔ بالکل درست کہا ہے تم نے

(عورت کی نظر بوڑھے پر پڑتی ہے جو اونگھ رہا ہے)

عورت:۔ (مسکرا کر) ذرا بابا جی کو دیکھو۔

مسافر: لگاتار مصیبتوں کے بعد اب کہیں جا کر آرام ملا ہے۔ سو گئے ہیں۔ آرام اور سکون کی نیند!

(منیر آتا ہے)

عورت:۔ (منیر سے) کہاں چلے گئے تھے۔ منیر!

لڑکا: بازار میں۔ امی! اتنا خوبصورت شہر ہے کہ کیا کہوں، پھل، مٹھائیاں، اونچے اونچے مکان، چوڑی چوڑی سڑکیں۔ بڑے بڑے شاندار باغ امی کیا کہوں۔

(ایک آدمی دروازے پر آتا ہے)

آدمی : کسی چیز کی ضرورت ؟

عورت : (شوہر سے) اور تو ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ پیٹ بھر گیا ہے۔

مسافر : (آدمی سے) شکریہ!

آدمی : کب تک ہمیں خدمت کا موقع ملے گا۔ ؟

عورت : مجھے تو یہ جگہ بہت اچھی لگتی ہے۔ بس یہیں رہیں گے!

مسافر : (آدمی سے) ہم یہیں رہیں گے۔

آدمی : نوازش اچھا دیکھیے یہاں کا اصول یہ ہے کہ ہم اپنے مہربانوں سے ایک ہفتے کا کرایہ وغیرہ پیشگی لے لیتے ہیں۔

(مسافر اور اس کی بیوی ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی)

جی میں نے عرض کیا۔ یہاں کا اصول یہی ہے۔ اس لئے تکلیف دے رہا ہوں۔

عورت :۔ (مرد سے) کیا کہتا ہے ؟

آدمی :۔ سو روپیہ عنایت فرما دیجیے۔

عورت :۔ روپیہ ؟

مسافر :۔ (آدمی سے) روپیہ کیسا ؟ آپ کیا فرماتے ہیں ؟

آدمی :۔ جی۔ میں نے عرض کیا نا۔ یہاں کا یہی اصول ہے

عورت :۔ (آدمی سے) اس سے پوچھو تم کون ہو ؟

مسافر : (آدمی سے) میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔

(آدمی کمرے کے اندر جاتا ہے)

آدمی :۔ میں کون سی ایسی بات کہہ رہا ہوں۔ جسے آپ سمجھ نہیں سکے!

مسافر: یہ روپے کی بات کیا ہے؟

(آدمی مسافر کو غور سے دیکھتا ہے)

آدمی: آپ پوچھ رہے ہیں۔ روپیہ کیسا

مسافر: جی ہاں!

آدمی: میں مذاق تو نہیں کر رہا!

مسافر: لیکن۔ دیکھئے تو۔ بزرگ نے کہا تھا یہ ہمارا شہر ہے

آدمی: شہر یقیناً آپ ہی کا ہے۔ مگر یہ ہوٹل آپ کا نہیں ہے۔ یہاں تو جو بھی رہتا ہے کرایہ وغیرہ دیتا ہے۔

عورت:۔ ہوٹل!

مسافر:۔ یہ ہوٹل ہے!

آدمی: تو کیا آپ اسے مہمان خانہ سمجھ کر آئے تھے۔

مسافر:۔ بزرگ نے کہا تھا کہ۔

آدمی:۔ صاحب! اس وقت وہ بزرگ نہیں اس ہوٹل کا منیجر آپ سے بات کر کر رہا ہے۔

(مسافر خاموش رہتا ہے)

دیجئے رقم! جلدی کیجئے مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں!

مسافر رقم۔ کیسی رقم؟

آدمی :۔ عجب معاملہ ہے پوچھ رہے ہیں رقم کیسی؟

مسافر:۔ جی میں بھی سوچ رہا ہوں بڑا عجیب معاملہ ہے۔ یہ شہر ہمارے لئے بنایا گیا ہے۔ ہم بڑا لمبا چوڑا سفر کر کے یہاں آئے ہیں۔

آدمی: آپ لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں یا چھوٹا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، روپیہ

نکالیے اور یہاں رہیے ورنہ —

مسافر :۔ ورنہ کیا ؟

آدمی :۔ یہاں سے فی الفور چلتے بنئے۔

مسافر :۔ کہاں ؟

آدمی :۔ یہ میں کیا جانوں ؟

عورت :۔ (مسافر سے) اس سے پوچھو وہ بزرگ کہاں ہیں۔ ہم اُن سے سخت شکایت کریں گے !

آدمی :۔ جائیے جاکر شکایت کرتے پھریئے۔ یہ کمرہ فوراً خالی کر دیجیے۔ کس پاگل خانے سے نکل کر آ گئے ہیں ادھر

مسافر :۔ مگر

آدمی :۔ مگر وگر کچھ نہیں صاحب میرے پاس بحث کے لیے وقت نہیں فوراً تشریف لے جائیے۔ پاس کوڑی نہیں اور آ گئے ہیں ہوٹل میں — سبحان اللہ

عورت :۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں !

مسافر :۔ اور میری سمجھ میں کب آ رہا ہے ؟

آدمی :۔ باہر سڑک پر جاؤ گے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگے گی تو سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔

مسافر : بزرگ سے بات کرنے کے بعد

آدمی : بزرگ بزرگ کیا لگا رکھی ہے۔ اگر فی الفور نہیں جاتے تو مجھے بیروں سے کہنا پڑے گا۔

مسافر : ذرا ٹھہریئے تو — میں ان بزرگ سے

آدمی : (دروازے پر جاکر) بیرا ادھر آؤ۔ فوراً

(مسافر، عورت اور لڑکا حیران کھڑے ہیں، پردہ گرتا ہے)

منظر بدلتا ہے

اس منظر میں پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج حاکمِ اعلیٰ کا دفتر پیش کرتی ہے۔ کمرہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ ہے سامنے بڑی میز، میز کے ایک سرے پر ٹیلی فون، اس کے بالمقابل دوسرے سرے پر فائلوں کے انبار۔ ان کے علاوہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کاغذ، خوش نما اور دیدہ زیب سٹیشنری، میز کے اس طرف حاکمِ اعلیٰ بیش قیمت سوٹ میں ملبوس، کرسی میں بیٹھا ہے۔ حاکمِ اعلیٰ کے دائیں طرف مسافر اور اس کا بوڑھا باپ کرسیوں میں بیٹھے حاکمِ اعلیٰ کو بڑی بے تابی سے دیکھ رہے ہیں۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ حاکمِ اعلیٰ ٹیلیفون کا ریسور واپس ٹیلیفون پر رکھ رہا ہے۔ چپڑاسی آتا ہے اور چند فائلیں فائلوں کے انبار میں رکھ جاتا ہے۔ حاکمِ اعلیٰ سرسری سی نظر فائلوں کے انبار پر ڈالتا ہے اور پھر مسافر کو دیکھنے لگتا ہے)

حاکمِ اعلیٰ: ہاں تو فرمایئے!

مسافر: کیا عرض کروں جناب! بزرگ نے فرمایا یہ شہر تمہارے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کے باغات، مکانات —

حاکمِ اعلیٰ: - (الفاظ کاٹ کر) ہاں ہاں۔ پھر

مسافر: مگر یہاں ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔

حاکمِ اعلیٰ :- کوئی پوچھتا نہیں — اوہو — بہت بڑی بات!

بوڑھا :- کیا کہیں جناب! اب تک سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں ملی۔

حاکم اعلیٰ :- اوہو۔

مسافر :- ہر جگہ ہم سے پیسے مانگتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں۔

حاکم اعلیٰ :- جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ حکومت آپ لوگوں کے لئے ایک بہت بڑی سکیم بنا رہی ہے۔ زیر غور سکیم پر کروڑوں روپیہ خرچ ہو گا۔ حکومت کی مخلصانہ کوشش یہ ہے۔ کہ یہ شہر جنت بن جائے۔ تھوڑا سا انتظار کیجئے۔ تھوڑا سا انتظار کیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ سمجھ لیا نا آپ نے

مسافر :- جی سمجھ لیا۔

بوڑھا :- حضور عرض یہ ہے۔

حاکم اعلیٰ :- ایک منٹ۔

(حاکم اعلیٰ ٹیلی فون کے نمبر گھمانے لگتا ہے)

خانصاحب (مسکراتے ہوئے) السلام علیکم خانصاحب قبلہ! —

بہت بہت مہربانی — دیکھیے — آپ نے بتایا نہیں۔ شاہ صاحب کب ہماری پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔ کیا فرمایا — نہیں — لیکن کیوں۔ بتایئے نا خاں صاحب — وجہ کیا ہے۔ ضرور ضرور فرمایئے کونسی شرط ہے۔ لائسنس۔ کتنے کا۔ پانچ لاکھ کا — دیکھئے نا خاں صاحب میں! بیک وقت تین لائسنس کیسے دلوا سکتا ہوں۔ فی الحال اڑھائی لاکھ کا سہی باقی اگلی ششماہی میں —

جی ہاں وعدہ! بالکل پکا۔ کل کے اخبار میں آپ کا بیان آ جائے — !

او تھینک یو — آپ کے معاملے کی مجھے پوری خبر ہے۔ میں اسد مرزا کا ٹرانسفر کرا رہا ہوں۔ اب چانس آپ کے بھانجے ہی کو ملے گا۔ انشاء اللہ شکریہ کیسا۔

ہم تو آپ کے ازلی اور ابدی خادم ہیں۔ تھینک یو سر!

(حاکمِ اعلیٰ ریسیور رکھ دیتا ہے۔ چپڑاسی اور فائل لے کر آتا ہے)

مسافر:۔ ہم عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں

حاکمِ اعلیٰ:۔ ہونا بھی یہی چاہیئے۔ ہر شخص کو عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ بزرگ محترم کا ایک ایک لفظ ہمارے دلوں میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ میری حکومت کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ اس شہر میں مساوات قائم ہو۔ روپیہ امیروں کے ہاں تجوریوں میں بند نہ ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس بہت بڑی سکیم کے علاوہ نو اور بڑی سکیموں پر بھی غور کر رہے ہیں۔ ان سکیموں پر ابتدائی کارروائی ہو رہی ہے۔ ان کے علاوہ پندرہ اور سکیمیں بھی ہیں۔ وہ دیکھئے۔

(حاکمِ اعلیٰ ایک الماری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مسافر اور بوڑھا اُدھر دیکھتے ہیں)

اس الماری میں سینکڑوں فائلیں پڑی ہیں — یہ سب کی سب فائلیں نئی سکیموں ہی کے بارے میں ہیں۔ تو صاحب! آپ کی حکومت آپ کے لیے کام نہیں کرے گی۔ ——— تو پھر کرے گی کیا؟ ذرا انتظار کیجئے — اور ہمیں کام کرنے کا موقعہ دیجیے۔ سمجھ لیا نا آپ نے!

مسافر: سمجھ لیا۔ عرض صرف یہ تھی۔

حاکمِ اعلیٰ: عرض کیا۔ حکم کیجئے۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔ ادنیٰ خادم ہیں!

(حاکمِ اعلیٰ گھنٹی بجاتا ہے۔ چپڑاسی آتا ہے)

رضوی کو بلاؤ۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ حاکمِ اعلیٰ ریسیور اٹھاتا ہے)

جی فرمایئے — کیا شیخ صاحب ہیں۔ آہا کہیئے شیخ صاحب! آج تو آپ نے کمال

ہی کر دیا ہے۔ کیسے یاد فرمایا لیا۔ قبلہ ہم غریبوں کو — میں نے عرض کیا نا بالکل مطمئن رہیئے۔ نئے ہسپتال کا ٹھیکہ آپ ہی کو ملے گا۔ ٹنڈر ونڈر کی بات چھوڑیئے۔ شیخ صاحب! یہ رسمی چیزیں وغیرہ تو ہوتی ہی رہتی ہیں پچھلے ٹھیکے کی مٹھائی نہیں کھلائی آپ نے — یاد ہے کچھ — ؟ تلافی کر دی جائے گی ؟ بہت بہتر — کوئی اور حکم ! صاحب وہ کام بھی ہو جائے گا۔ پریشان ہونے کی کیا بات ہے — کیا کہا — میری بات چھوڑیئے۔ قبلہ! ہماری بیگم کو بیوک کا نیا ماڈل بہت پسند آگیا ہے انہیں خوش کر دیجئے۔ تو پھر ؟ او تھینک یُو۔ تھینک یو۔ شیخ صاحب !

(حاکمِ اعلیٰ رسیور رکھ دیتا ہے۔ پرائیویٹ سیکرٹری رضوی آتا ہے)

رضوی : جی حکم !

حاکمِ اعلیٰ :۔ یوں کام نہیں چلے گا میرے بھائی! میری ٹیبل پہ فائلوں کے انبار لگتے چلے جاتے ہیں۔ اتنا وقت کہاں ہے میرے پاس۔ نیازی صاحب سے کہنا فائلیں خود ہی دیکھ لیا کریں —— جو فائلیں میں کہوں وہی بھیجا کریں۔ سمجھ لیا نا۔

رضوی :۔ جی ہاں !

حاکمِ اعلیٰ :۔ یہ فائلیں بھجوا دو انہیں — اور دیکھو ان میں سے مس نازنین اور مس مہ جبین کی فائلیں یہیں رہنے دو۔

رضوی : بہت اچھا جناب۔

(رضوی فائلیں دیکھنے لگتا ہے)

حاکمِ اعلیٰ :۔ رضوی تازہ ترین سکیموں کی فائلیں کہاں رکھی ہیں ؟

رضوی :۔ ان سکیموں کی فائلیں ابھی بنی نہیں ہیں ! جناب

حاکمِ اعلیٰ :۔ (مسافر سے) پندرہ سکیمیں اور تیار ہو گئی ہیں۔ یہ سب کی سب سکیمیں آپ! در

صرف آپ لوگوں کے لئے ہیں۔ عنقریب آپ دیکھیں گے۔ کہ یہ شہر آپ کے لئے سچ مچ جنت کا نمونہ بن جائے گا! اتنے بڑے کاموں کے لئے بہت وقت چاہیئے مگر ہم سارے کام بہت ہی کم وقت میں کر دیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ سمجھ لیا نا آپ نے۔

(چپڑاسی آتا ہے اور ایک ملاقاتی کارڈ دیتا ہے۔ حاکمِ اعلیٰ کارڈ لیتا ہے چپڑاسی نکل جاتا ہے)

بلاؤ۔

مسافر:۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ عرض یہ تھی کہ اس وقت ——————

(سیٹھ صاحب آتے ہیں۔ بھاری بھر کم آدمی ہیں اور نہایت اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس ہیں)

حاکمِ اعلیٰ:۔ (تعظیماً کھڑے ہو کر) آیئے سیٹھ صاحب

(سیٹھ صاحب کرسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ حاکمِ اعلیٰ بھی بیٹھ جاتا ہے)

فرمایئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ حضور کی! نئے کارخانے کا کب افتتاح ہو رہا ہے؟

سیٹھ صاحب: چند روز تک ہو جائے گا۔

حاکمِ اعلیٰ: مبارک بادیں وہیں آکر دوں گا!

سیٹھ صاحب: مبارک بادیں کیسی؟ آپ کو ہماری پرواہی کیا ہے جناب؟

حاکمِ اعلیٰ: کیوں سیٹھ صاحب! خیریت تو ہے۔ کچھ تو کہیئے بندہ پرور!

سیٹھ صاحب: برا نہ مانئے گا جناب! خدا لگتی کہوں گا۔ معاف کیجئے آپ کو (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) اس کرسی پر بٹھانے والے ہم ہیں مگر افسوس آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا ہے کہ ہمارے ہی مخالف ہو گئے ہیں۔

حاکم اعلیٰ :۔ اوہو۔۔۔ سمجھا! غالباً آپ "حقوقِ مزدوراں" کے قانون سے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

سیٹھ صاحب :۔ غالباً نہیں یقیناً۔

حاکم اعلیٰ :۔ دیکھئے نا سیٹھ صاحب! کچھ مصلحتیں بھی ہوتی ہیں۔ ان کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ آپ ہماری مجبوریاں بھی تو دیکھئے نا!

سیٹھ صاحب :۔ معلوم ہے آپ کے الیکشن پر ہم نے کتنا روپیہ صرف کیا تھا؟

حاکم اعلیٰ : وہ درست ہے۔ مگر میں کہہ رہا ہوں سیٹھ صاحب! آپ اس قانون سے بالکل نہ گھبرائیے۔ دراصل یہ ایک چال ہے اپوزیشن کا منہ بند کرنے کے لئے۔ اصل بات عمل کی ہے اور۔ آپ جانتے ہیں۔

(ہلکا سا قہقہہ لگاتا ہے) اور کیا کہوں!

سیٹھ صاحب :۔ تاہم۔

حاکم اعلیٰ :۔ ارے صاحب! بالکل مطمئن رہئے کوئی بات بھی آپ کے مفاد کے خلاف نہیں ہوگی۔ اس کا میں پورا ذمہ لیتا ہوں۔ یہ قانون دنون تو بس کاغذی کھیل ہے! کاغذی کھیل۔ سمجھ لیا سیٹھ صاحب!

سیٹھ صاحب :۔ آپ کو یہ ذمہ لینا ہی پڑے گا۔ ورنہ آپ خوب جانتے ہیں۔

حاکم اعلیٰ :۔ جانتا ہوں صاحب! بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

(سیٹھ صاحب اُٹھ کر جانے لگتے ہیں۔ حاکمِ اعلیٰ اٹھ کر ان سے ہاتھ ملاتا ہے چپراسی فائلیں اٹھا کر لے جا رہا ہے)

مسافر :۔ جناب! آپ کوئی ایسا انتظام کر دیں کہ میں۔۔۔ اور میرے عزیز عزت کی زندگی بسر کر سکیں!

حاکم اعلیٰ :۔ (ہاتھ کے اشارے سے خاموش کراتے ہوئے) ہو جائے گا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔

ابھی ابھی آپ کو بتایا تو ہے کہ کتنی شاندار سکیمیں آپ لوگوں کے لیے تیار ہو چکی ہیں۔

(رضوی آتا ہے)

رضوی : ظہوری صاحب

حاکمِ اعلیٰ : لے آؤ (مسافر سے) آپ دیکھ رہے ہیں کتنی مصروفیت رہتی ہے۔ ذرہ برابر سکون میسر نہیں ہوتا (سر اس طرح دباتا ہے جیسے درد محسوس کر رہا ہے)

مسافر : جی ہاں۔ تو ہماری گزارش یہ تھی کہ — اب ہم یونہی مارے مارے نہ پھریں۔

(ظہوری آتا ہے۔ چھوٹے قد کا آدمی۔ سیاہ رنگ کی اچکن پہنے ہوئے)

حاکمِ اعلیٰ : (تعظیماً کھڑے ہو کر) آئیے ظہوری صاحب!

(ظہوری کرسی میں بیٹھ جاتا ہے)

حالات کیا ہیں بندہ پرور

ظہوری :۔ وہ معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے مگر — ؟

حاکمِ اعلیٰ : بلڈنگ کا قبضہ آپ کو نہیں ملا ابھی تک؟

ظہوری :۔ گڑبڑ یہ ہے کہ وہاں کچھ لوگ رہتے ہیں۔ غریب غربا وغیرہ۔ جب تک بلڈنگ خالی نہ ہو جائے مشینیں کیسے فٹ کروا سکتا ہوں؟ (ذرا خاموش رہ کر) یہ ہے اصل گڑبڑ

حاکمِ اعلیٰ :۔ کتنے لوگ ہوں گے؟

ظہوری :۔ چند ایک ہوں گے۔ میں اس بات پر تیار ہوں کہ ان لوگوں کے لیے نہر کے کنارے جو بیکار زمین پڑی ہے وہاں جھونپڑیاں بنوا دوں۔ لحافوں کا انتظام بھی کر دوں گا۔

حاکمِ اعلیٰ :۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے اور کیا چاہیئے! نہیں؟

ظہوری: بلڈنگ سے نکلتے ہی نہیں - کیا کیا جائے؟

حاکمِ اعلیٰ: کہتے کیا ہیں؟

ظہوری: کہتے ہیں شہر میں طغیانی آئی رہتی ہے — میں کہتا ہوں طغیانی کا انتظام تو ہو ہی جائے گا۔

حاکمِ اعلیٰ: کیوں نہیں ہوگا؟

ظہوری: آپ کوشش کرکے بلڈنگ خالی کرادیں

حاکمِ اعلیٰ: کرادی جائے گی - ہاں تو وہ بات آپ کو یاد ہے نا -

ظہوری: یاد ہے صاحب! — کوٹھی والی بات نا! بے فکر رہیئے - اور مجھے اجازت دیجئے - خدا حافظ -

(ظہوری چلا جاتا ہے

رضوی آتا ہے)

رضوی: مس نازنین آئی ہیں -

حاکمِ اعلیٰ: (بے تابی سے) کہاں ہیں؟

رضوی: باہر اپنی کار میں -

حاکمِ اعلیٰ: اوہو آج ان کے ساتھ لنچ کا وعدہ ہے (کرسی سے اٹھتا ہے)

مسافر: جی وہ عرض —

حاکمِ اعلیٰ: رضوی! دیکھنا - ان کے لئے کچھ انتظام وام کردو بھئی!

(حاکمِ اعلیٰ دروازے کی طرف جانے لگتا ہے - وہاں جاکر رک جاتا ہے اور رضوی سے مخاطب ہوتا ہے)

دیکھنا آغا صاحب کا کوئی عزیز آئے گا - اس سے کہہ دینا دو چار دن تک آپ کی پوسٹنگ ہو جائے گی - اور دیکھنا مس مہ جبیں اگر آجائیں تو انہیں گرانڈ ہوٹل

میں بھیج دینا۔ سمجھ بیا نا!

رضوی: بہت اچھا جناب!

(مسافر حاکم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے مگر وہ جلدی سے باہر نکل جاتا ہے
پردہ گرتا ہے)

منظر بدلتا ہے

اب سٹیج پر لیڈر کا مخصوص کمرہ دکھایا گیا ہے۔ یہ کمرہ بھی کافی شاندار ہے۔
سامنے میز پر اخبارات، رسالے، کتابیں وغیرہ انتشار کے عالم میں ہیں سامنے
دیوار پر لیڈر کی ایک بڑی تصویر ہیں لیڈر جسم چغے میں چھپائے اور گلے میں
پھولوں کے ہار ڈالے نظر آتا ہے۔ لیڈر کی بائیں جانب مسافر اور اس
کا بوڑھا باپ کرسیوں میں بیٹھے ہیں مسافر کے آگے میز پر چائے اور پلیٹ
میں کچھ بسکٹ بھی نظر آرہے ہیں۔ لیڈر ایک اخبار کی ورق گردانی کر رہا
ہے۔ اور سر بھی ہلاتا جاتا ہے۔ جیسے مسافر کی بات سن رہا ہے)

مسافر: معلوم ہوتا ہے ہمارے دکھوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا

لیڈر: ختم ہو گیا ہے۔ دیکھیں گے کس طرح ختم نہیں ہوتا۔ جب آپ کا یہ خادم زندہ
ہے تو آپ دکھی کیونکر رہ سکتے ہیں؟ بالکل ناممکن ہے۔

مسافر: حاکم اعلیٰ نے تو صرف سکیموں ہی کا ذکر کر کے ہمیں ٹرخا دیا۔

لیڈر: فکر نہ کیجئے یہ حکومت ہم الٹ کر رکھ دیں گے۔ بہت جلد الٹ کر رکھ دیں گے
خدا کا فضل شاملِ حال ہونا چاہیئے۔

بوڑھا: کہنے لگے۔ آپ لوگوں کے لئے بہت کچھ ہو رہا ہے۔ مگر ہمیں ابھی تک
سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں ملی!

لیڈر: انقلاب بڑی تیزی سے آرہا ہے۔ اس انقلاب کے سیلاب میں غریبوں کو ستانے والی سب طاقتیں خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گی۔ آنے والے سیلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اچھا وقت زندگی کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

بوڑھا: دروازے پر بزرگ نے کہا تھا۔ یہ شہر غریبوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ بالکل الٹا ہے۔

لیڈر: یقیناً یہ شہر غریبوں ہی کے لئے ہے — اور — (لیڈر کی نگاہ اخبار کے ایک صفحے پر جم کر رہ جاتی ہے۔ گھنٹی بجاتا ہے۔ لیڈر کا سیکرٹری آفاقی آتا ہے۔ آفاقی دبلا پتلا آدمی ہے۔ آنکھوں پر عینک، ہاتھ میں فائل)

آفاقی! یہ دیکھا تم نے!

آفاقی: کیا ہے جناب!

لیڈر: میرا کل والا بیان کتنا مختصر کر کے چھاپا ہے۔ اور فوٹو تو دی ہی نہیں۔

آفاقی: میں نے شاداں صاحب سے کہا تھا۔ کہ بیان کے ساتھ فوٹو نہیں آئی۔ کہنے لگے۔ عملے کی غفلت کا نتیجہ ہے۔

لیڈر: اس کا علاج صرف ایک ہے۔ اور وہ علاج یہ ہے کہ اب اپنا اخبار نکالا جائے۔

آفاقی: بالکل درست فرمایا آپ نے۔ انتظامات ہو رہے ہیں

لیڈر: اچھا وہ بیان لکھ لیا تم نے؟

آفاقی: (فائل سے کاغذ نکالتے ہوئے) جی ہاں۔ (پڑھتے ہوئے) شہر کے رہنمائے اعظم مولانا فیضی نے فرمایا ہے مجھے حکومت کے اس ظالمانہ اقدام سے سخت دکھ ہو رہا ہے۔ حکومت نے شہر کی سب سے بڑی بلڈنگ سے پچاس کے قریب مفلوک الحال

نادار اور خستہ حال خاندانوں کو بے دخل کر کے سخت زیادتی کی ہے۔ اور اس زیادتی پر جتنے غم و غصہ کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ آگے چل کر مولانا نے کرم نے مطالبہ کیا ہے۔ حکومت ان لوگوں کو فوراً واپس بلڈنگ میں بلائے۔ یہ شہر مٹھی بھر امیروں کے لئے نہیں، لاکھوں غریبوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر حکومت نے اپنا حکم واپس نہ لیا تو اس کے نتائج بڑے ناخوشگوار ثابت ہوں گے۔

لیڈر :۔ (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) اوں ہونہہ

آفاقی : جی کیا!

لیڈر : میاں ایہاں تو بڑا زوردار فقرہ آنا چاہیئے۔ کچھ اس قسم کا۔ (پر جوش انداز میں میز پہ مکا مار کر) اگر حکومت نے یہ فیصلہ واپس نہ لیا تو میں کفن سر پہ باندھ کر میدان میں آجاؤں گا۔ اور میں نہیں میری لاش ہی واپس آئے گی۔ کچھ ایسی بات لکھو میاں! آخر لیڈر کا بیان ہے کچھ مذاق تو نہیں!

آفاقی : بہتر (آفاقی جانے لگتا ہے)

مسافر : حاکمِ اعلیٰ نے ہمارے سامنے کہا تھا: غریبوں کو بلڈنگ سے نکال دیا جائے گا۔

لیڈر : میں تو کہتا ہوں قیامت آگئی ہے۔ کیا غضب ہے۔ اس ظہوری کم بخت نے سمگلنگ اور بلیک میں لاکھوں روپیہ کمایا ہے۔ اب چاہتا ہے کہ بڑی بلڈنگ میں کارخانہ لگوائے اور وہاں کے رہنے والوں کو ایسی جگہ پھینک دے جہاں برسات میں ندی کا پانی گھروں کو برباد کر دیتا ہے خدا کی پناہ۔ خیر اب کے حکومت سے وہ ٹکر ہو گی کہ وہ ٹکر ہو گی کہ — میدان میں آئے تو چھٹی کا دودھ نہ یاد آجائے۔ تو بات ہی کیا ہے۔ (لیڈر گھنٹی بجاتا ہے۔ آفاقی آتا ہے)

ان کے لیے (مسافر اور بوڑھے کی طرف اشارہ کر کے) چائے اور مٹھائی۔

آفاقی بہتر! (آفاقی جانے لگتا ہے)

لیڈر: دیکھو — وہ دعوت نامہ لکھ لیا ہے۔

آفاقی: (فائل میں سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے) جی ہاں (پڑھتے ہوئے) "شہر میں جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں ان کے پیشِ نظر قوم کا اجتماعی مفاد نہیں ہے۔ ضرورت ایک ایسی پارٹی کی ہے۔ جو ذاتی اغراض سے بلند ہو کر قومی بہتری کے رات دن کوشاں ہو۔ اور اس مقصد کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں ایسی پارٹی کا خیال مدت سے پرورش پا رہا ہے۔ آیئے سب مل کر سوچیں اور کام کریں "

لیڈر: ٹھیک ہے یہ دعوت نامہ سب اخباروں اور قومی ورکروں کو بھجوا دو اور اخبارات میں اعلان کرا دو کہ جمعہ کے روز اس سلسلے میں پریس کانفرنس ہو گی۔ اور وہاں کانفرنس کے بعد چائے نہیں ڈنر ہو گا۔

آفاقی:۔ بہت اچھا۔ اور پرسوں جو آپ نے بیان شائع کروایا تھا کہ آپ مجلسِ جمہور میں شامل ہو گئے ہیں۔

لیڈر:۔ میری طرف سے اخبارات میں بیان شائع کرا دو کہ میرا مجلسِ جمہور میں شامل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ نامہ نگار نے غلط بیان میرے ساتھ منسوب کیا ہے۔

آفاقی:۔ بہت بہتر۔ (جانے لگتا ہے۔ دروازے پر جا کر ٹھہر جاتا ہے) کلرکوں کا ڈیپوٹیشن آیا ہے۔

لیڈر: ان لوگوں سے کہہ دو۔ حکومت ان کے مطالبے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہی ہے۔

آفاقی: وہ ملنا چاہتے ہیں۔

لیڈر: ٹال دو یار۔ دیکھتے نہیں بے حد مصروف ہوں۔

(آفاقی چلا جاتا ہے)

توبہ ایک منٹ بھی آرام نہیں ملتا۔ زندگی دو بھر ہو گئی ہے۔ کروں کیا! قوم کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

(مسافر اور بوڑھا کچھ کہتے نہیں لیڈر کو دیکھتے رہتے ہیں۔ آفاقی آتا ہے)

آفاقی: ظہوری صاحب آئے ہیں

لیڈر: کیا کہا — ظہوری — ہونہہ — ابھی تو حملے کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ خیر بلا لاؤ۔

(آفاقی چلا جاتا ہے اور جب دوبارہ آتا ہے تو اس کے ساتھ ظہوری بھی ہے)

ظہوری: (تعظیماً جھکتے ہوئے) میں نے کہا آداب عرض ہے! قبلہ محترم!

لیڈر: (انداز میں روکھا پن ہے) جی فرمایئے!

ظہوری: نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضرِ خدمت ہو گیا ہوں۔ سنا تھا آپ ایک نہایت شاندار اخبار کا اجرا کر رہے ہیں۔ سوچا مبارک باد دے آؤں۔ امید ہے آپ کا اخبار ہر طرف ایک ہنگامہ برپا کر دے گا!

لیڈر: آپ نے خوب سوچا ہے۔

(ظہوری کرسی میں بیٹھ جاتا ہے)

ظہوری: طبیعت کیسی ہے! صاحبزادہ یورپ کب روانہ ہونے والا ہے۔

لیڈر: ہفتہ عشرہ تک روانہ ہو جائے گا۔

ظہوری: خاکسار کسی کام آسکتا ہے۔ تو فرمایئے۔ ویسے میں خود ہی صاحبزادے سے مل کر گفتگو کر لوں گا۔ اور سنیئے نیو کالونی میں میرا ایک بنگلہ بے کار پڑا ہے آپ

پسند فرمائیں تو اخبار کا دفتر بنا لیجئے!

لیڈر: (دلچسپی لیتے ہوئے) کیا فرمایا آپ نے!

ظہوری: آپ نے شاید وہ بنگلہ دیکھا نہیں۔ پندرہ کمرے ہیں اس میں اور ہر کمرہ بڑا وسیع ہے۔ ظاہر ہے آپ کا اخبار قوم کی خدمت کرے گا۔ میں اخبار کی کچھ خدمت کروں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں قوم کی خدمت کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے نئے کارخانے کا مستقل اشتہار اخبار کے لئے وقف ہوگا۔ کم از کم ایک ہزار کے اشتہار اور بھی دلا سکتا ہوں۔

لیڈر: (زیادہ دلچسپی سے) شکریہ۔ نیا کارخانہ کب کام شروع کر رہا ہے؟

ظہوری: فیضی صاحب کیا عرض کروں۔ آپ تو میرے نہایت مشفق اور مخلص دوست ہیں۔ آپ سے کیا بات چھپاؤں گا۔ میرے دشمن میرے خلاف پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ بڑی بلڈنگ کے رہنے والوں کو نکال دیا ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ میں نے ان کے لئے کتنا روپیہ صرف کر کے جھونپڑیاں وغیرہ بنوا دی ہیں۔ لحافوں کا اہتمام الگ کر رہا ہوں۔ کارخانہ قائم ہوگا تو اس میں صرف میرا فائدہ نہیں ساری قوم کا فائدہ ہوگا۔ ان لوگوں کو تو میرے ساتھ خدا واسطے کی دشمنی ہے۔ جھوٹا پراپیگنڈا کر کے مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ خدا کا کوئی بندہ کوئی اچھا کام کرنا چاہے تو اس کے راستے میں پتھر بن جاتے ہیں۔

لیڈر:۔ سچ فرماتے ہیں آپ۔ لوگوں کی یہی حالت ہے۔

ظہوری:۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ میرا دل قوم کے درد سے بیگانہ نہیں۔ آپ کی تو ساری عمر ہی قومی کاموں میں گزر رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں قوم کے لئے کچھ کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

لیڈر:۔ یہی میں سوچ رہا تھا ظہوری صاحب غریبوں کو پریشان کس طرح

کر سکتے ہیں ؟

ظہوری : یہ آپ کی کرم فرمائی ہے ورنہ بندہ کس لائق ہے ۔ فیضی صاحب ! میرا تن من دھن آپ کے لیے حاضر ہے ۔ آپ کی ہدایت پر قوم کی کچھ خدمت کر سکا تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی ۔

لیڈر : خدا آپ کو جزائے خیر دے ۔ نئی پارٹی قائم کر رہا ہوں ۔ آپ نے سن لیا ہو گا

ظہوری : مجھے اس پارٹی کا ادنےٰ خادم سمجھیے ۔

لیڈر :۔ جزاک اللہ

(لیڈر گھنٹی بجاتا ہے ۔ آفاقی آتا ہے)

آفاقی :۔ جی

لیڈر : وہ جو بیان لکھوایا تھا نا ۔

آفاقی : مکمل ہو گیا ہے ۔ بہت زور دار ہو گیا ہے ۔

لیڈر : (الفاظ کاٹتے ہوئے) مجھے دو ۔

(آفاقی کاغذ لیڈر کو دیتا ہے ۔ لیڈر اسے پھاڑ دیتا ہے ۔ مسافر اسے حیرت سے دیکھ رہے ہیں آفاقی چلا جاتا ہے)

ظہوری : قبلہ ایک گزارش تھی ۔

لیڈر : فرمایئے ؛

ظہوری : اس وقت حضور کو تھوڑی سی فرصت تو ہو گی ۔ پہلے چل کر غریب خانے پر روکھی سوکھی کھائیں گے ۔ پھر میں آپ کو بنگلہ دکھانے کے لیے چلوں گا ۔

لیڈر : ظہوری صاحب ۔ بے انتہا کام ہیں ۔ اتنا مصروف ہوں کہ کیا کہوں ۔

ظہوری : ابھی واپس لے آؤں گا آپ کو چلیے تو سہی اٹھ بیٹھیے نا قبلہ !

لیڈر : آپ نے مجبور کر دیا ہے۔ اچھا۔ (مسافر سے) صاحب! آپ پھر کبھی ملئے

(مسافر حیران پریشان لیڈر کو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ لیڈر ظہوری
کے ساتھ باہر نکل جاتا ہے اور پردہ گرتا ہے)

منظر بدلتا ہے

"اسوا" (آل سٹی ویمنز ایسوسی ایشن) کا مرکزی دفتر، خاصا سجا سجایا کمرہ
سامنے بڑی میز۔ اردگرد کرسیاں، دو تین تپائیاں۔ ایک طرف صوفہ
سیٹ۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ دائیں طرف سے جہاں دروازہ
ہے، بڑی بیگم اور آپا جان داخل ہوتی ہیں۔ دونوں کے سوٹ بہت
شاندار ہیں۔ صحت نہایت اچھی ہے۔ آپا جان ادھیڑ عمر کی عورت
ہیں۔ بڑی بیگم چالیس کے پیٹے میں ہوں گی۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی
صوفے کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں)

بڑی بیگم : آپ نے درست فرمایا ہے آپا جان!

آپا جان : میں نے بھی اس چیز کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔

بڑی بیگم : صرف محسوس کرنے سے کام نہیں چلے گا آپا جان! میں صاف صاف کہے
دیتی ہوں کہ ہماری "اسوا" ایسی باتوں سے رسوا ہو جائے گی۔

آپا جان : یہ تو ہے اور اس کی تائید میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔

بڑی بیگم : ذرا سوچیئے نا آپا جان! جس عورت کا ظالم شوہر فاقہ کش غریبوں کو بلڈنگ
سے نکال کر وہاں کارخانہ بنا دے۔ وہ ہماری ایسوسی ایشن کی جنرل سیکرٹری کیسے
رہ سکتی ہے لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ پہلے ہی کہنے والے کہتے رہتے
ہیں کہ "اسوا" صرف افسروں کی بیگمات کا ادارہ ہے! لوگوں کا منہ بھلا کون

کرسکتا ہے؟

آپا جان :۔ میں تو کہہ رہی ہوں آپ کا خیال بالکل درست ہے۔

(صوفے کے قریب چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد دونوں بیٹھ جاتی ہیں۔
آپا جان صوفے میں اور بڑی بیگم کرسی میں)

بڑی بیگم : آپ ایسوسی ایشن کی صدر ہیں۔ بڑی آسانی سے بیگم ظہوری کو مستعفی ہونے پر مجبور کر سکتی ہیں۔

آپا جان : آل رائٹ۔ آل رائٹ!

(اسوا کی اسسٹنٹ سیکرٹری رضیہ داخل ہوتی ہے۔ چھریرے بدن کی لڑکی عمر بیس بائیس برس۔ لباس صاف ستھرا مگر قیمتی نہیں آنکھوں پر عینک)

بڑی بیگم :۔ (رضیہ سے) رضو! ایجنڈا کیا ہے۔ آج کی میٹنگ کا

رضیہ : پچھلی تین میٹنگوں کی ساری کی ساری باتیں

آپا جان : خدا کی پناہ بڑا وقت لگے گا۔ مجھے تو آج کئی فنکشن اٹنڈ کرنا ہیں۔ چیف سیکرٹری کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ حاکم اعلیٰ کے ہاں چائے ہے۔ نئی فلم کا سنسر شو ہے۔ اور ـــ

بڑی بیگم :۔ اور میری سنو! دو بجے ریس میں جانا ہے۔ وہاں خان بہادر کی بیگم آ رہی ہیں آپ کو معلوم ہے نا میری سلمیٰ کے لئے ان کا صاحبزادہ بڑا موزوں رشتہ ہے۔

آپا جان : میں نے تو سنا تھا رسمی بات چیت ہو چکی ہے۔

بڑی بیگم :۔ ہوئی ابھی نہیں۔ بیگم صاحبہ کل ہی یورپ سے آئی ہیں۔ سنا ہے۔ آج ریس میں آئیں گی۔

آپا جان : اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے "اسوا" کا کوئی فنکشن کر لیتے ہیں۔ بیگم صاحبہ یہیں آجائیں گی۔

بڑی بیگم: یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر ذرا ان کا منشا تو معلوم کر لوں پہلے!

آپا جان: (رضیہ سے) دیکھو ذرا چپڑاسن کو بلانا۔ (رضیہ دروازے پر جاکر 'علیہ' کہہ کر آواز دیتی ہے)

بڑی بیگم: آج تو کوئی چھوٹا سا مسئلہ ہے نہیں۔ بہت کام کرنے ہیں شام تک!

آپا جان: یہی میں چاہتی ہوں۔ (چپڑاسن آتی ہے۔ بوڑھی نحیف و نزار عورت۔ لباس پھٹا ہوا) — دیکھو علیہ! چائے لے آؤ۔ (چپڑاسن جانے لگتی ہے) ٹھہرو۔ پوری بات تو سن لیا کرو۔ چائے کے ساتھ سموسے، کباب، دو چار انڈے، چانپ ٹوسٹ وغیرہ بھی لانا۔

بڑی بیگم: کھانا نہیں کھایا آج۔

آپا جان: کھانا کیا کرے۔ ہر وقت بھاگ دوڑ رہتی ہے۔ کھایا پیا منٹوں میں ہضم ہو جاتا ہے۔ (مسکراتی ہیں)

بڑی بیگم: ویسے بھی ماشا اللہ صحت بہت اچھی ہے۔ چشم بد دور؟

آپا جان: (آہ بھر کر) صحت؟۔ کہاں ہے صحت؟ میری تو جان پہ ہی آ بنی ہے سکھ کا سانس لینا نصیب ہی نہیں ہوتا چھوٹے صاحبزادے فرماتے ہیں بھائی جیسی بیوک ہی لوں گا۔ رات دن کان کھاتا رہتا ہے۔ اب چھوٹے میاں کو کون سمجھائے کہ ایکس چینج میں کتنی مصیبت اٹھانا پڑتی ہے۔ پہلے چار لاکھ کا لائسنس ملتا تھا۔ اب دو لاکھ کا بھی نہیں ملا۔ ادھر اقبال میاں کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔ کل سے "ڈبو" پھر بیمار ہو گیا ہے۔ کیا بد قسمت شہر ہے۔ یہاں کتوں کے علاج کے لئے کوئی اچھا ڈاکٹر بھی نہیں۔

بڑی بیگم: پرسوں سے میری صوفیہ بھی بیمار ہے دو ڈاکٹروں کو دکھا چکی ہوں کہتے ہیں بلیوں کو ایسی بیماریاں ہوتی ہی رہتی ہیں سب بے چاری بڑی کمزور ہو گئی ہے۔

آپا جان: یہ ڈاکٹر ڈاکٹر جاہل ہیں جی! — (چپڑاسن آتی ہے۔ چائے اور دوسرا سامان دو

تپائیوں پر لگا کر ان کے آگے رکھ دیتی ہے ۔ عورت یعنی مسافر کی بیوی آتی ہے۔ اور
ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے)

بڑی بیگم : (رضیہ سے) یہ کون ہے ؟

رضیہ : اسی کی درخواست آئی تھی جس کا میں نے پرسوں ذکر کیا تھا۔

بڑی بیگم : اچھا

(آپا جان چیزوں پر پل پڑتی ہیں ۔ رضیہ آ کر بڑی بیگم کے لئے چائے بنانے لگتی ہے)

آپا جان : درخواست کہاں ہے ؟

رضیہ : میرے پاس ہے ۔

(دو بیگمات آتی ہیں ان میں سے ایک غرارہ پوش ہے اور دوسری
ساڑھی پوش گردنوں میں موتیوں کے ہار چمک رہے ہیں دونوں کے
ہاتھوں میں پرس ہیں)

بڑی بیگم : آئیے ۔ آئیے آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا ۔

غرارہ پوش : کارروائی شروع ہو گئی کیا ؟

بڑی بیگم : ابھی نہیں

آپا جان : (غرارہ پوش اور ساڑھی پوش سے) شوق فرمایئے ۔

(غرارہ پوش اور ساڑھی پوش ایک ایک سموسہ اٹھا لیتی ہیں)

ساڑھی پوش : آج کا ایجنڈا کیا ہے ؟

آپا جان : آج کی میٹنگ بڑی جلدی ختم کر دینے کا ارادہ ہے ۔ بہت سے فنکشن اٹنڈ
کرنا ہیں ۔ آپ بھی یقیناً مصروف ہوں گی ۔

ساڑھی پوش : جی ہاں ۔ بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے ۔ کوئی خاص بات ؟

بڑی بیگم : خاص بات یہ ہے کہ بیگم ظہوری آئیں تو انھیں صاف صاف کہہ دیا

جائے کہ آج ہی اپنا استعفے پیش کردیں۔

ساڑھی پوش اور غرارہ پوش :۔ (ایک ساتھ) وہ کیوں!

بڑی بیگم : بدنامی سے بچنے کے لئے ان کے شوہر نامدار نے جو کچھ کیا ہے اس کی تو آپ کو خبر ہی ہے۔

ساڑھی پوش : معلوم ہے اور خوب معلوم ہے!

غرارہ پوش :۔ بیگم ظہوری ہماری سہیلی ہیں تو کیا ہوا — ان کی خاطر ہمیں اپنی ایسوسی ایشن کو تو بدنام نہیں کرنا چاہیئے ۔کیوں آپا جان۔

آپا جان : ہاں ۔ آں! (چاپ کھانے میں مصروف رہتی ہیں)

غرارہ پوش : کسی نئے فنکشن کا پروگرام بھی تو بتایئے آپا جان!

ساڑھی پوش : آپا جان! مجھے آپ سے بڑی شکایت ہے پچھلے فنکشن میں جو بیوگاں کی امداد کے لئے ہوا تھا میری ستارہ کو سب سے آخر میں ڈانس کا چانس دیا گیا تھا۔

غرارہ پوش : اور میری نرگس کو سب سے پہلے جب ابھی وزیر بھی نہیں آئے تھے کیا فائدہ ایسے ڈانس کا۔

ساڑھی پوش : جمیلہ بہت اچھی رہیں ۔ ان کی دونوں صاحبزادیوں کو اس وقت چانس ملا جب سب کے سب آچکے تھے۔

آپا جان :۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ (مرچوں کی شدت سے شی شی کرتے ہوئے) رضو پانی!

(رضیہ جوان کے لئے چائے بنا کر پیچھے ہٹی تھی ۔ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

غرارہ پوش : (بڑی بیگم سے) قاضی صاحب کے صاحبزادے فرانس سے آگئے؟

بڑی بیگم: آ گئے۔ اور ساتھ پیرس کی حور بھی لے آئے۔ آپ کی توقعات کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ (مسکراتی ہے)

آپا جان: (غرارہ پوش سے) میں بتاتی ہوں۔ (ہاتھ یوں اٹھاتی ہیں جیسے کہہ رہی ہیں۔ مجھے پانی پی لینے دیجئے)۔ ایک منٹ! (رضیہ پانی کا گلاس لے کر آتی ہے۔ آپا جان گلاس خالی کر کے ایک طرف تپائی پر رکھ دیتی ہیں) قاضی کا لڑکا فرانس سے عورت لے آیا تو کیا ہوا — (غرارہ پوش سے) میں نے تمہاری غزالہ کے لیے شیخ صاحب کی بیگم سے بات کی تھی۔ BYTHEWAY ہمارے اگلے فنکشن پر وہ آ رہی ہیں تم خود ان سے گفتگو کر لینا۔ سمجھ لیا نا!

غرارہ پوش: ان کے چھوٹے صاحبزادے کا نام اقبال ہے نا!

آپا جان: (چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے) وہی — جو قالینوں کا بزنس کرتا ہے۔

غرارہ پوش: کاروں کا بزنس بھی تو ہے اس کا۔

آپا جان: ہاں یہ بھی ہے۔

ساڑھی پوش: (عورت کو دیکھ کر) آپا یہ کون ہے؟

آپا جان: (رضیہ سے) رضو! یہ کہاں سے آئی ہیں؟

رضیہ: میں نے بتایا تھا نا آپا! اس نے ملازمت کے لیے درخواست دی ہے۔

(بیگم ظہوری آتی ہے۔ بڑے ٹھسے کی عورت ہے۔ سوٹ نہایت شاندار، ہاتھ میں پرس)

بیگم ظہوری: آداب عرض! (سب خاموش رہتی ہیں۔ بیگم ظہوری آگے بڑھ کر آپا جان کے ساتھ صوفے میں بیٹھ جاتی ہے) ذرا لیٹ ہو گئی ہوں۔ کارروائی ختم تو نہیں ہوئی ابھی۔ (اب کے بھی خاموشی رہتی ہے) معلوم ہوتا ہے بڑا اہم مسئلہ زیر بحث ہے۔

بڑی بیگم : جی ہاں۔ اور یہ اہم مسئلہ آپ کے متعلق ہے۔
بیگم ظہوری :۔ میرے متعلق۔ خوب۔ بلکہ بہت خوب! تو فرمایئے! بندی حاضر ہے۔
(پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک چک نکالتی ہے اور چک آپا جان کی طرف بڑھاتی ہے) یہ لیجئے۔ پندرہ ہزار کا چک ہے۔ معمولی رقم ہے۔ مگر ایسوسی ایشن کے کئی کام ہو سکتے ہیں۔ (آپا جان بڑی بیگم کا منہ تک رہی ہیں) لیجئے نا آپا جان۔

آپا جان : کیوں شاہدہ؟
(بڑی بیگم کو گھور کر دیکھتی ہیں)

بڑی بیگم : جو مرضی آپ کی۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟
(دو تین لمحے خاموش رہتی ہے)

آپا جان : کہو نا شاہدہ اور (غرارہ پوش اور ساڑھی پوش سے) آپ بھی فرمایئے۔
غرارہ پوش : تو۔ اچھا۔ (چک لیتے ہوئے) تھینک یو بیگم ظہوری!
(آپا جان چک لے کر رضیہ کو اشارہ کرتی ہے۔ جو آ کر چک بڑے احترام سے لے لیتی ہے)

بیگم ظہوری : ایک کپ مجھے بھی مل جائے گا کیا؟
آپا جان : کیوں نہیں۔ سب کچھ آپ ہی کا تو ہے۔ رضیہ! کھانے کے لئے کچھ منگواؤ۔
بیگم ظہوری : نہیں۔ نہیں۔ صرف چائے۔
(رضیہ چائے بناتی ہے)

بڑی بیگم : (بیگم ظہوری سے) ظہوری صاحب کی طبیعت اب تو ٹھیک ہے نا؟
بیگم ظہوری : جی ہاں پچھلے دنوں کچھ زیادہ ہی علیل ہو گئے تھے۔ مجھے بھی زکام ہو گیا تھا۔
(عورت کو دیکھتی ہیں) یہ کون ہیں؟

آپا جان: (رضیہ سے) رضیہ! یہ ملازمت چاہتی ہے کیا؟

رضیہ: جی ہاں۔

آپا جان: آسامیاں کون کون سی خالی ہیں۔

رضیہ: "اسوا" سکول کے لیے ایک معلمہ چاہیئے۔ نئی شاخ کے لیے ایک اسسٹنٹ سیکرٹری، دارالمستورات کے لیے ایک نگران کار — اور اسوا ڈپو کے لیے ایک اسسٹنٹ۔

آپا جان: (عورت سے) تم پڑھی لکھی ہو۔ چوتھی جماعت کو پڑھا سکتی ہو؟

عورت: - جی ہاں!

آپا جان: - اس کی درخواست لاؤ میرے پاس رضیہ!

رضیہ: معلمہ کی جگہ کے لیے تو بیگم فخرالدین نے کسی کی سفارش کر رکھی ہے۔

آپا جان: اور کیا بتایا — اسسٹنٹ سیکرٹری —؟

ساڑھی پوش: آپا جان! آپ کو یاد نہیں رہا۔ اس جگہ کے لیے میں نے پرسوں آپ سے گفتگو کی تھی۔

آپا جان: اچھا — اور کون سی آسامیاں ہیں!

رضیہ: دارالمستورات کے لیے نگران کار اور "اسوا" ڈپو کے لیے ایک اسسٹنٹ۔

آپا جان: یہ دو ہیں

رضیہ: نگران کار کے لیے خان بہادر کی صاحبزادی نے کہا تھا — کہ جب تک میں نہ بتاؤں یہ جگہ خالی رہے۔ اور اسسٹنٹ کے لیے کل مرزا صاحب کا فون آیا تھا۔

آپا جان: تو — تو — خیر! اور کوئی جگہ

رضیہ : فی الحال اور کوئی جگہ نہیں !

آپا جان :۔ (عورت سے) گھبراؤ نہیں ۔ آسامیاں خالی ہوتی ہی رہتی ہیں ۔ تمہاری درخواست ہمارے سامنے رہے گی ۔ کام ہو جائے گا ۔ انشاء اللہ

رضیہ :۔ (عورت سے) فی الحال تم جاؤ ! کوئی جگہ تمہارے لائق ہوئی تو میں تمہیں اطلاع بھیج دوں گی ۔

(عورت خاموشی کے ساتھ دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پردہ گرتا ہے)

منظر بدلتا ہے

یہ منظر سٹیج پر ایک ایسی جگہ پیش کرتا ہے ۔ جسے موٹر گراج کہا جائے تو غیر مناسب نہیں ہوگا ۔ فرش پر چند برتن بکھرے پڑے ہیں ۔ ایک طرف دو کنستر ہیں ، کنستروں کے پاس میلے کچیلے کپڑے نظر آ رہے ہیں ۔ ایک طرف ایک انگیٹھی ، توا اور چمٹا نظر آ رہا ہے ۔ دروازہ دائیں دیوار میں ہے ۔ کمرے میں کوئی روشندان اور کھڑکی نہیں ہے سامنے چٹائی بچھی ہے ۔ چٹائی پر دو تکیے پڑے ہیں ۔ چٹائی کے ساتھ ایک چارپائی بچھی ہے ۔ جس پر بوڑھا لیٹا ہوا ہے ۔ جو بار بار کھانستا ہے ۔ اور کھانستے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ لیتا ہے ۔ لڑکا بوڑھے کے پاؤں دبا رہا ہے ، انگیٹھی کے پاس تپائی کے ایک ٹکڑے پر عورت بیٹھی چھری سے ساگ بنا رہی ہے ۔ بوڑھا کھانستے ہوئے بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے عورت اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف جاتی ہے)

عورت : بابا !

بوڑھا: پانی

(عورت گھڑے سے گلاس میں پانی لے کر آتی ہے)

عورت : لو بابا

بوڑھا : (گلاس ہونٹوں سے لگا کر دو گھونٹ پی کر) ساجو آیا۔

عورت : نہیں!

بوڑھا : کیوں نہیں آیا۔

عورت : کہتے تھے کارخانے سے آدھی چھٹی لے کر دوا تلاش کروں گا۔

بوڑھا : دوا کی کیا ضرورت ہے بیٹی! دوا پر خرچ کر دو گے تو پھر۔ اس کے لئے کہاں سے پیسہ آئے گا۔؟

عورت :۔ یہ نہ کہیے بابا! (آہ بھر کر منہ دوسری طرف پھر کر آنسو خشک کرتے ہوئے) یہ نہ کہیے!

بوڑھا : یہ تو ہو گا ہی۔ تم لوگوں نے روٹی کھائی! (عورت خاموش رہتی ہے۔) کیوں بیٹی!— انگیٹھی میں آگ نہیں ہے! (عورت اب کے بھی خاموش رہتی ہے بوڑھا لڑکے کی طرف دیکھتا ہے) تم بھی بھوکے بیٹھے ہو! منیر!!

(لڑکا خاموش رہتا ہے)

عورت : ترکاری لے آئی ہوں۔

بوڑھا : آٹا ہے گھر میں؟

عورت : کل ختم ہو گیا تھا۔ آج وہ لیتے آئیں گے۔

بوڑھا : اچھا— یہ دن بھی دیکھنا تھا یہاں آکر۔ کیا شاندار جنت بنی ہے۔ ہمارے لیے۔ کیا سہانے سپنے دیکھے تھے۔ اور نتیجہ—؟

(آہ بھر کر گردن فرطِ مایوسی سے جھکا لیتا ہے)

عورت: آپ کے لئے کچھ دودھ ہی لے آؤں؟

بوڑھا: نہیں۔ تم لوگ رات سے بھوکے ہو۔

عورت: آپ تو بیمار ہیں۔

(مسافر ایک پوٹلی اور ایک تھیلا اٹھائے اندر آتا ہے۔ کپڑے میلے کچیلے چہرہ گرد آلود۔ کمر کسی قدر خمیدہ، داڑھی بڑھی ہوئی)

بوڑھا: آگئے بیٹا!

مسافر: آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟

بوڑھا: ٹھیک ہوں۔ دوا تو نہیں لائے۔

(مسافر دونوں چیزیں عورت کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

مسافر: بلیک میں پانچ گنا زیادہ قیمت پر ملتی ہے۔ آج اتنے پیسے نہیں تھے۔

بوڑھا: دوا کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔

عورت: کیوں بابا۔

بوڑھا: روٹی پکاؤ بچہ بھوک سے نڈھال ہو گیا ہے۔ (لڑکے سے) جاؤ باہر جا کر کھیلو۔ جاؤ منیر!

(لڑکا باہر چلا جاتا ہے۔ عورت پوٹلی میں سے آٹا نکال کر مٹی کی پرات میں ڈالتی ہے۔ برتن میں پانی لاتی ہے اور چٹائی پر بیٹھ کر آٹا گوندھنے لگتی ہے۔ مسافر اس دوران تھیلے میں سے کوئلے نکالتا رہتا ہے۔ لڑکا اندر آتا ہے)

مسافر: کیوں۔ اتنی جلدی آ کیوں گئے؟

لڑکا: وہ آ رہے ہیں۔

مسافر: وہ کون؟
لڑکا: جنہوں نے ہمیں رہنے کے لئے یہ جگہ دی تھی۔
مسافر: منشی صاحب؟

(منشی دروازے پر آتا ہے)

منشی: وہ بات یہ ہے۔ ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔ قصّہ یہ ہوا ہے کہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے نے اپنی الگ گاڑی خرید لی ہے اور اس کے لئے یہ جگہ آپ کو خالی کرنی ہوگی۔

(مسافر منشی کو اس انداز سے دیکھنے لگتا ہے جیسے اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں اور وہ زبان سے ایک لفظ بھی نکال نہیں سکتا۔ عورت بے حس و حرکت ایک طرف کھڑی ہے، لڑکا کبھی باپ کو دیکھتا ہے۔ اور کبھی منشی کو۔ منشی دروازے کی طرف جانے لگتا ہے اور اسی سناٹے میں پردہ گرتا ہے۔)

منظر بدلتا ہے

گراج کے باہر مسافر عورت اور لڑکا ایک طرف کھڑے ہیں۔ مسافر کی کمر خمیدہ ہو چکی ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہی لاٹھی دکھائی دے رہی ہے جو سب سے پہلے منظر میں اس کے بوڑھے اور ضعیف باپ کے ہاتھ میں تھی۔ عورت نے ہاتھ میں ایک گٹھری اٹھا رکھی ہے۔ لڑکے نے جو ٹوکری اٹھائی ہوئی ہے۔ اس میں کچھ برتن ہیں۔

عورت :- (شوہر کو بے بسی کے انداز میں دیکھتے ہوئے) اب ہم کہاں جائیں (شوہر اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ خلا میں گھورتا رہتا ہے) میں نے کہا اب ہم کہاں جائیں!

(مسافر اب کے بھی کوئی جواب نہیں دیتا۔ بدستور خلا میں گھورتا رہتا ہے۔ عورت کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ وہ منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔ لڑکے کے گال پر بھی آنسو بہ رہے ہیں — اور پردہ گرتا ہے)

جمیلہ

(الجزائر کی وطن پرست لڑکی)

کردار

شاعر قاسم

جمیلہ

جمیلہ کی ماں

عبداللہ

یوسف سعدی

جلیل

فرحت

حسن

فرانسیسی کیپٹن ، بریگیڈیر جنرل

جمیلہ کا چینی وکیل

دو گواہ - ایک مرد ، ایک عورت

اِن کے علاوہ

فرانسیسی سپاہی

پہلا منظر

(" الجزائر" کے کسی بازار کا ایک حصّہ۔
ہر طرف ایک سناٹا۔ کوئی راہ گیر دکھائی نہیں دیتا۔ یوں محسوس ہوتا
ہے جیسے لوگ سہمے ہوئے گھروں میں بند ہیں۔
ایک طرف سے چار فرانسیسی سپاہی سنگینیں کندھوں پہ اٹھائے آتے
ہیں اور سٹیج کے وسطی حصے میں پہنچ کر رک جاتے ہیں)

پہلا سپاہی : (اِدھر اُدھر دیکھ کر) کتنی خاموشی ہے۔ یہ شہر ہے یا کوئی قبرستان ہے۔
دوسرا سپاہی : ہے تو شہر ہی مگر قبرستان بن چکا ہے
تیسرا سپاہی : قبرستان کیوں نہ بنتا (سنگین بلند کر کے) یہ سنگین پورے الجزائر کی موت
کا پیغام ہے۔ کس میں جرأت ہے کہ چوں بھی کر سکے!
دوسرا سپاہی : اس قبرستان میں اب زندگی نہیں آسکتی اور ہمیں زندوں سے
سروکار ہے مُردوں سے نہیں!
چوتھا سپاہی : تو پھر کیا ارادہ ہے؟
پہلا سپاہی : تمہارا ارادہ کیا ہے؟
تیسرا سپاہی : گشت کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ سپاہی کو آبادی میں گشت کرنی چاہیے

کسی جنگل میں نہیں!

دوسرا سپاہی: میرا خیال ہے ہمیں واپس چلے جانا چاہیئے۔ بیکار گھومنے سے فائدہ؟

چوتھا سپاہی: میرا بھی یہی خیال ہے۔

تیسرا سپاہی: تو چلیں واپس!

چوتھا سپاہی: یقیناً

دوسرا سپاہی: چلو پھر۔

(سپاہی جانے لگتے ہیں۔ دور سے الجزائر کے قومی شاعر، قاسم، کی آواز آتی ہے

قاسم گا رہا ہے

"اے مادرِ وطن! اے مری مادرِ وطن"

پہلا سپاہی: (رک کر) یہ کیا؟

(باقی سپاہی بھی رک جاتے ہیں)

دوسرا سپاہی: کسی الجزائری کی آواز۔ یہ کیا تماشا ہے؟

تیسرا سپاہی: تم نہیں جانتے یہ کون ہے؟

دوسرا سپاہی: کون ہے یہ؟

تیسرا سپاہی: وہی دیوانہ شاعر۔

دوسرا سپاہی: دیوانہ شاعر کون؟

تیسرا سپاہی: وہی جو بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اور گاتا رہتا ہے۔

چوتھا سپاہی: دیوانہ ہو یا فرزانہ۔ اسے آواز بلند کرنے کا حوصلہ کیسے ہوا؟ وطن وطن چیخ رہا ہے یہ ہماری توہین نہیں تو اور کیا ہے؟

(شاعر کی آواز آرہی ہے

اے مادرِ وطن، اے مری مادرِ وطن")

دوسرا سپاہی: اسے موت کا خوف نہیں کیا؟

تیسرا سپاہی: خوف ہوتا تو یوں گاتا پھرتا؟ بے باک آدمی ہے۔ لوگوں کو ہمارے خلاف اکساتا رہتا ہے۔

چوتھا سپاہی: یہ چیز ناقابلِ برداشت ہے۔

تیسرا سپاہی: چلو اس کی آواز بند کر دیں۔ ہمیشہ کے لیے۔

(سپاہی جدھر سے آئے ہیں۔ ادھر جانے لگتے ہیں۔ دو تین لمحے سٹیج خالی رہتی ہے۔

سٹیج پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص آتا ہے۔ ہاتھ میں الجزائری پرچم۔ چغے اور کرتے میں ملبوس، برابر گاتا ہوتا قدم اٹھا رہا ہے۔

"اے مادرِ وطن، اے مری مادرِ وطن"

جدھر سے قاسم آیا ہے ادُھر سے جمیلہ بھی آتی ہے۔ جمیلہ بیس بائیس برس کی ایک تنومند اور گٹھے ہوئے جسم کی خوبصورت لڑکی ہے۔ گول چہرہ بڑی بڑی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، ہر نقش ابھرا ہوا۔ سیاہ گھناؤنے بال جو رخساروں پر لہراتے ہوئے چوٹیوں کی صورت میں سینے پر بکھر گئے ہیں۔ سفید فراک پہنے ہوئے۔ ہاتھ میں چند کتابیں۔

جمیلہ ایک طرف رُک کر شاعر کو دیکھنے لگتی ہے۔ شاعر قاسم گا رہا ہے۔

اے مادرِ وطن — اے مری مادرِ وطن

پہنا ہے تو نے کس لیے زخموں کا پیرہن

تو ہے کہ ہے زمین پر اک لاشِ بے کفن

اے مادرِ وطن - اے مری مادرِ وطن

کیوں آج بجھ گئے ترے پھولوں کے سب شرار
کلیاں ہیں اشک بار تو غنچے ہیں دل فگار
تیری بہار چھین لی کس نے مرے چمن

اے مادرِ وطن — اے مری مادرِ وطن

اے مادرِ وطن — اے مری مادرِ وطن
کیوں ہو رہی ہے خاک بسر تیری آبرو
پانی سے بھی زیادہ ہے ارزاں ترا لہو
نیزوں میں ہیں پروئے ہوئے تیرے گلبدن

اے مادرِ وطن — اے مری مادرِ وطن

(شاعر کی آواز زیادہ پُرجوش ہو جاتی ہے)

تم ہو کدھر بتاؤ جو انانِ تُند خو
دیکھو تو پائمال ہوئی کس کی آبرو
دیکھو تو خاک میں ہے مِلا کس کا یہ لہو

صد چاک ہو رہا ہے یہاں کس کا پیرہن

اے مادرِ وطن — اے مری مادرِ وطن

جمیلہ شاعر کی طرف بڑھنے لگتی ہے کہ ایک فرانسیسی سپاہی تیزی سے وہاں آتا ہے۔

جمیلہ سپاہی کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اب وہ دکھائی نہیں دیتی۔

سپاہی شاعر کے پاس پہنچ کر، مڑ کر بلند آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے۔ "ادھر آؤ"

باقی تینوں سپاہی بھی وہاں آجاتے ہیں۔ اور سنگینیں تان کر شاعر کو

گھیرے میں لے لیتے ہیں۔

شاعر بدستور بے نیازی سے گا رہا ہے۔

صد چاک ہو رہا ہے یہاں کس کا پیرہن

اے مادرِ وطن — اے مری مادرِ وطن

(پہلا سپاہی سنگین کی نوک شاعر کے سینے سے لگا دیتا ہے)

پہلا سپاہی: (گرج کر) بند کرو اپنی آواز

شاعر: یہ میری آواز نہیں الجزائر کی مظلوم روح چیخ رہی ہے۔

دوسرا سپاہی: تو اسے بند ہو جانا چاہیئے یہ ہمارا حکم ہے۔

شاعر: تم چپ کے پرچے لگاؤ اور ہم چیخ بھی نہ سکیں۔ کیا یہی تمہارا انصاف ہے؟

پہلا سپاہی: (نوک چبھوتے ہوئے) خاموش کمینے کتے!

شاعر: یہ آواز کبھی بند نہیں ہوگی۔

پہلا سپاہی: بند ہوگی — اور ہمیشہ کے لیے بند ہوگی۔

شاعر: نہیں ہو سکتی اور نہیں ہوگی۔

پہلا سپاہی: تو پھر لے مزا۔

(سپاہی شاعر پر پل پڑتے ہیں)

شاعر: یہ آواز سارے الجزائر میں گونجتی رہے گی!

(شاعر گر پڑتا ہے۔ پرچم کو بوسہ دیتا ہے)

ایک دن یہ پرچم بلند ہوگا — آزادی کا پرچم — آزاد الجزائر کا پرچم۔

(پہلا سپاہی سنگین اس کے جسم میں پیوست کر دیتا ہے۔ شاعر "الجزائر

زندہ باد" کہہ کر دم توڑ دیتا ہے۔ سپاہی اسے ٹھوکر مار کر یہ اندازہ کر لیتے ہیں

کہ وہ مر گیا ہے۔
اطمینان حاصل کرنے کے بعد چاروں سپاہی جانے لگتے ہیں۔ سپاہیوں
کے جانے کے بعد جمیلہ سٹیج پر آتی ہے۔ شاعر کی نعش کے پاس
آتی ہے۔ جھک کر اُسے دیکھتی ہے۔ پھر بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے
ہاتھ میں لے کر کہتی ہے۔)

جمیلہ: اے شہیدِ وطن! میں تیرے مقدس خون کی قسم کھا کر عہد کرتی ہوں کہ اپنی
زندگی وطن کے لیے قربان کر دوں گی! اگر آزاد وطن کے پرچم کو بوسہ نہ دے سکی تو
پھانسی کی رسی کو ضرور چوم لوں گی۔

(جمیلہ شاعر کے ہاتھ کو بوسہ دیتی ہے اور پرچم اٹھا لیتی ہے۔ اس
کے ساتھ ہی پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(جمیلہ کے گھر کا ایک کمرہ۔ متوسط درجے کا سامان ایک میز، تین کرسیاں۔
میز کے اوپر کتابیں، اخبارات اور کاغذ قرینے اور سلیقے سے رکھے ہوئے۔
دروازہ بائیں دیوار میں۔
سٹیج خالی ہے۔ چند لمحوں کے بعد جمیلہ آتی ہے۔ بغل میں کتابیں۔ دائیں
ہاتھ میں پرچم۔ جمیلہ بغل سے کتابیں نکال کر میز پر رکھ دیتی ہے۔
اسی اثنا میں دروازے میں سے اُس کی ماں کی 'جمیلہ' کہتی ہوئی آواز آتی ہے۔
جمیلہ مڑ کر دیکھتی ہے)

جمیلہ: جی امی!

(ماں دروازے پر آتی ہے۔ سن چالیس کے اوپر۔ بیٹی سے گہری مشابہت

لباس فراک جو زردی مائل ہے
ماں اور بیٹی ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔
ماں آگے آتی ہے)

ماں: کہاں چلی گئی تھی تو جمیلہ! اتنی دیر کہاں رہی!

(جمیلہ خاموش رہتی ہے)

سخت پریشان ہو گئی تھی۔ چاروں طرف فرانسیسی درندے گھوم رہے ہیں۔

(ماں جمیلہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہے۔ یکایک اس کی نظر پرچم پر پڑتی ہے۔ استفسار طلب نظروں سے بیٹی کو دیکھتی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی)

جمیلہ: امی! یہ شاعر قاسم کا پرچم ہے

ماں: اسے تو جلادوں نے مار دیا ہے۔

جمیلہ: میری آنکھوں کے سامنے ہی اس کا مقدس خون خاک میں ملا تھا۔

ماں: تمہارے سامنے — تو کہاں تھی اس وقت؟

جمیلہ: میں گھر آ رہی تھی کہ جلادوں نے اسے سنگینوں میں پرولیا۔ (خلا میں دیکھتے ہوئے جیسے وہی منظر آنکھوں کے سامنے ابھر رہا ہے) اس نے جان دینے سے پہلے پرچم کو چوما اور کہا۔ "الجزائر زندہ باد"
کتنی پاکیزہ ہے اس کی شہادت لگتا تھا۔ الجزائر کی روح اس کے پیکرِ خاکی میں بول رہی ہے۔ زخم پر زخم کھائے مگر آخری سانس تک آواز بند نہ کی! کتنا عظیم انسان تھا وہ۔ کتنا عظیم محبِ وطن

ماں: قاسم ہمارا قومی شاعر تھا۔ آج ہم نے الجزائر کا بطلِ جلیل کھو دیا ہے۔

(دو تین لمحوں کا غمناک وقفہ)

جمیلہ: امی!

ماں : کیا بات ہے؟

جمیلہ : آج میں نے عہد کر لیا ہے کہ یا تو آزادی کے پرچم کو بوسہ دوں گی یا پھانسی کی رسّی کو —

(ماں گھور کر بیٹی کو دیکھتی ہے)

میں نے شہید شاعر کے سامنے قسم کھائی ہے کہ آج سے میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف آزادیٔ وطن کی جد و جہد ہے۔ اس کے لیے جیوں گی اور اسی کے لئے مروں گی — (پرچم بلند کرکے) یہ پرچم آزادی کا پرچم بنے گا — اور یہ آزاد الجزائر کی بلندیوں میں لہرائے گا۔ یہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ بہت جلد آئے گا!

(ماں خاموشی سے اسے دیکھ رہی ہے)

تو خاموش کیوں ہے، امی۔ کیا تو نہیں چاہتی کہ تیری جمیلہ آزادی کی جنگ میں حصّہ لے۔ کیا تیری آرزو نہیں ہے کہ تیری لختِ جگر شہادت کا رتبہ پائے۔ کیوں امی جان۔ اس طرح خاموش کیوں ہے۔ میں جانتی ہوں تو کیا سوچ رہی ہے۔ کس تصور سے تیرا دل بوجھل ہو گیا ہے۔

(آواز میں جذبات کی شدت)

مگر مجھے بتاؤ۔ امی! کیا یہ تیرے لیے فخر نہیں ہوگا کہ تیری بچی آزادی کی جنگ میں شہید ہو جائے۔ وطن کے لئے کتنے نوجوان ہر روز قربان ہو رہے ہیں — تیری بچی بھی قربان ہو جائے گی تو کیا قیامت آجائے گی امی! وہ ہر روز مرنے والے بھی تو تیرے ہی بچے ہیں — بتا نا امی — کہو نا — امی۔

(جمیلہ ماں سے لپٹ جاتی ہے)

امی!

ماں : رب الکعبہ تجھے اپنے عہد پر قائم رکھے۔

جمیلہ : اوہ امی — پیاری امی۔

(ماں محبت سے اپنا ہاتھ بیٹی کے سر پر پھیرتی ہے)

ماں : میری قابلِ فخر جمیلہ — میری بچی

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

الجزائر کے کوہستانی علاقے میں مجاہدین الجزائر کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم "محاذِ قومی آزادی" کی ایک خفیہ قیام گاہ۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ چند فٹ لمبا اور قریب قریب اسی قدر چوڑا کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں ہے۔ اس لیے دن کے وقت بھی یہاں کسی قدر اندھیرا پھیلا رہتا ہے۔ آنے جانے کے لیے سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ جو اندر سے بند ہے۔

کمرے کا ایک خفیہ راستہ بھی ہے جو ایک تہخانے سے ہو کر باہر جاتا ہے۔ یہ خفیہ راستہ مشرقی دیوار میں ہے۔ اس پر دیوار ہی کے رنگ کی ایک چٹائی ٹنگی ہوئی ہے۔ جب تک خاص طور پر نہ دیکھا جائے یہ چٹائی نظر نہیں آتی!

دن کا تیسرا پہر

کمرے میں دو بڑی موم بتیاں روشن ہیں۔ ایک سامنے کی دیوار میں ایک ابھری ہوئی اینٹ پر جل رہی ہے اور دوسری کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی ایک معمولی میز کے سرے پر ایک مختصر سا حلقۂ نور

پیدا کر رہی ہے ـــــ موم بتی کے پاس تین رائفلیں بھی دکھائی
دے رہی ہیں۔

اس میز کے اردگرد چار معمولی کرسیاں بچھی ہیں۔ ان میں سے
بائیں کونے کی کرسی پر عبداللہ بیٹھا ہے اور غور سے "محاذِ قومی
آزادی" کے رہنما یوسف سعدی کو دیکھ رہا ہے۔ یوسف سعدی
اضطراب کے عالم میں میز کے پاس ٹہل رہا ہے اور بار بار نظریں اُٹھا
کر دروازے کی جانب دیکھتا ہے جیسے بڑی بے چینی سے کسی کا
انتظار کر رہا ہے۔

یوسف: (رُک کر) جمیلہ ابھی تک آئی نہیں!

عبداللہ: اب تک تو اُسے ضرور آجانا چاہیئے تھا۔

یوسف: (دروازے پر نظریں جما کر) اب تک تو کبھی ایسا نہیں ہوا ـ جو کام بھی
اس کے سپرد کیا گیا ہے اس نے عین وقت پر کیا ہے۔

عبداللہ: آخر ایک عورت ہی تو ہے!

یوسف: عورت (گھور کر عبداللہ کو دیکھتے ہوئے) تم اسے عورت کہتے ہو ـ
بربّ الکعبہ! ایسی جانباز اور بہادر مجاہدہ مادرِ وطن نے آج تک پیدا نہیں کی،
مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی رگوں میں انسانی خون کی بجائے
بجلیاں مچل رہی ہیں۔

(یوسف سعدی میز کی طرف بڑھتا ہے اور ایک کرسی پر ہاتھ رکھ کر ٹھہر جاتا
ہے۔ اس کی نظریں بدستور عبداللہ کو گھور رہی ہے)

عبداللہ: یہ بالکل درست ہے۔ جمیلہ ہماری سب سے بڑی مجاہدہ ہے مگر اس وقت
ہمارے وطن میں چاروں طرف فرانسیسی درندوں کے غول کے غول پھر رہے

ہیں۔ انھیں جمیلہ کی کارروائیوں کا علم ہو چکا ہے اور وہ رات دن اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

(یوسف سعدی اسے اس انداز سے دیکھتا ہے گویا اس کے بیان کی تائید کر رہا ہے، دروازے پر دستک ہوتی ہے، عبداللہ جلدی سے کھڑا ہو جاتا ہے)

آ گئی جمیلہ

(یوسف سعدی دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگتا ہے مگر عبداللہ تیزی سے وہاں پہنچ جاتا ہے، عبداللہ دروازے کے پاس جاکر کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

باہر سے آواز آتی ہے "وطن" عبداللہ دروازہ کھول دیتا ہے، جلیل آتا ہے، جلیل ایک نوجوان سپاہی ہے، یوسف سعدی اور عبداللہ کی طرح کوٹ پتلون پہنے ہوئے، جلیل کمرے کے اندر آجاتا ہے تو عبداللہ دروازہ بند کرنے لگتا ہے)

جلیل: (یوسف سعدی سے) السلام علیکم یا قائد!

یوسف: وعلیکم السلام یا اخی!

عبداللہ: (اپنی کرسی کی طرف لوٹتے ہوئے) جمیلہ کو دیکھا ہے تو نے جلیل!

جلیل: صبح وہ ذوادہ کی قیام گاہ میں تھی، اس وقت نئے ممبر بھرتی کیے جا رہے تھے۔ جب نئے ممبروں نے قاعدے کے مطابق اپنے لہو سے آزادی کے معاہدے پر دستخط کرنے کا ارادہ کیا تو جمیلہ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور للکار کر کہا "آج سے اس رسم کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے مجاہدوں کا لہو ان کے بازوؤں ہی میں رہنا چاہیے"۔ اور یہ الفاظ سن کر ہم نے معاہدے کا

کاغذ الگ کر دیا۔

یوسف: یہ تم نے بہت اچھا کیا!

جلیل: اس وقت وہ کرنل بیلا کی طرف جانے کو کہہ رہی تھی، وہاں سے تو وہ صبح کے وقت ہی چلی گئی تھی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا؟

عبداللہ: ہماری مجاہدہ دشمنوں کے قبضے میں جا چکی ہے!

یوسف: (بڑے اعتماد سے) نہیں! — ہرگز نہیں! — ایسا نہیں ہو سکتا!

(یوسف سعدی ٹہلنے لگتا ہے، عبداللہ اور جلیل کرسیوں کی طرف بڑھتے ہیں یوسف سعدی میز کے پاس رک کر عالمِ اضطراب میں ایک رائفل اٹھا لیتا ہے اور پھر ٹہلنے لگتا ہے۔ جلیل اور عبداللہ کرسیوں پر بیٹھتے نہیں، کھڑے رہتے ہیں)

جلیل: اگر آج جمیلہ یہاں پہنچ گئی تو یہ ایک معجزہ ہوگا!

یوسف: جمیلہ خطروں کا مقابلہ کرنا خوب جانتی ہے وہ خطروں کا مقابلہ کرکے ضرور پہنچ جائے گی، انشاءاللہ!

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

جلیل: خدا کرے جمیلہ ہو۔

(عبداللہ دروازے پر جا کر رک جاتا ہے۔ یوسف سعدی رک کر ٹکٹکی باندھ کر دروازے کی طرف دیکھ رہا ہے۔

باہر سے آواز آتی ہے "دطن" عبداللہ دروازہ کھولتا ہے۔ فرحت آتا ہے نوجوان سپاہی۔ چھوٹی داڑھی، لباس چغہ نما لمبا کرتہ، نیچے پاجامہ۔ فرحت آگے بڑھتا ہے)

فرحت: السلام علیکم!

جلیل اور عبداللہ: (ایک ساتھ) وعلیکم السلام۔

یوسف: فرحت!

فرحت: یا قاید!

یوسف: جمیلہ تمہارے یہاں پہنچی تھی کیا؟

فرحت: جی ہاں۔ آپ کا پیغام مل گیا تھا، دو سو مجاہد 'تبہ' کی طرف بھیج دیے گئے تھے!

یوسف: مگر جمیلہ؟

فرحت: (الفاظ کاٹتے ہوئے) یہاں نہیں آئی کیا؟

عبداللہ: نہیں!

فرحت: اس نے بتایا تھا کہ ندی کے محاذ پر کئی سپاہی دشمن کی بمباری سے زخمی ہو گئے ہیں۔ ان کی مرہم پٹی کے لیے جا رہی ہوں! یقیناً وہ اُدھر گئی ہوگی!

عبداللہ: ندی کے محاذ پر تین بار بمباری ہو چکی ہے!

(عبداللہ دروازہ بند کر کے جلیل کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے)

یوسف: زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے سے پہلے اسے عبدالکریم کے ہاں ایک نقشہ پہنچانا تھا۔ اس وقت اُس نقشے کی نہیں دوسرے نقشے کی ضرورت ہے۔

فرحت: جب وہ قیام گاہ سے نکل رہی تھی تو اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ وہ ایک دو بجے تک ضرور قائد کے پاس پہنچ جائے گی۔

عبداللہ: اور جب وہ نہیں آئی تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

جلیل: مگر میرا دل کہتا ہے وہ ضرور آئے گی۔

یوسف: ہاں — وہ ضرور آئے گی۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا ہے — اس کا

فرض ختم نہیں ہوا۔

(دروازے کے باہر سے آواز آتی ہے: "وطن" جمیل دروازے کی طرف جاتا ہے۔ باقی لوگ دروازے کو بڑے اضطراب سے دیکھنے لگتے ہیں)

یہ بھی جمیلہ کی نہیں، حسن کی آواز ہے۔

عبداللہ: حسن کے سوا اور کوئی نہیں!

(جمیل دروازہ کھولتا ہے۔ حسن آتا ہے۔ نحیف و نزار شخص۔ لباس، ملبا کرتہ اور پاجامہ۔ ہاتھ میں رائفل)

یوسف: (فوراً) جمیلہ کا کچھ پتہ

حسن: اگر وہ یہاں نہیں آئی تو پھر — ہمیں اس کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہیئے، بارہ بجے کے قریب وہ ہمارے یہاں پہنچی تھی اور نقشہ دے کر چلی گئی تھی۔

یوسف: اس کے بعد!

حسن: زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرنے جا رہی تھی۔

عبداللہ: ندی کے محاذ پر دشمن نے بہت بے رحمی سے بمباری کی ہے اور تین بار کی ہے۔

جلیل: تو — (عبداللہ کو دیکھتا ہے)

عبداللہ: اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

حسن: ہماری مجاہدہ چلی گئی (لہجے میں شدید درد) آخر چلی گئی۔

(دروازے پر دستک اور ایک نسوانی آواز "وطن")

عبداللہ اور جلیل: (ایک ساتھ) آ گئی!

حسن: شکر ہے پروردگار! تیرا

یوسف: جمیلہ آگئی!

(سب کے سب دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ یوسف سعدی
سب سے آگے پہنچ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ جمیلہ دروازے میں
داخل ہوتی ہے)

مرحبا جمیلہ!

(جمیلہ اندر آتی ہے۔ جسم پر سفید فراک۔ جس پر خون کے دھبے پڑے
ہیں، آنکھوں اور ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ)

جمیلہ: السلام علیکم یا قائد!

یوسف: وعلیکم السلام یا بنت الجزائر!

(دروازے کے پاس ہی عبداللہ، جمیل، حسن اور فرحت اس کے
گرد حلقہ سا بنا لیتے ہیں، جمیلہ میز کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ باقی
لوگ بھی اس کے ساتھ قدم اٹھانے لگتے ہیں۔ میز سے ذرا فاصلے
پر جمیلہ رُک جاتی ہے۔
یوسف سعدی اس کے قریب آتا ہے)

یہ دھبے کیسے تمہارے لباس پر!

جمیلہ: زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے سے کچھ داغ لگ گئے ہیں۔ ندی کے کنارے
دشمن نے تیسری بار بمباری کی ہے۔

یوسف: کتنے شہید ہوئے؟

جمیلہ: ستر۔ خدا کا شکر ہے ہمارے زخمیوں کی جانیں بچ گئیں۔

یوسف: اب وہ کہاں ہیں؟

جمیلہ: سپاہی انھیں اٹھا کر مسجد کے نیچے لے گئے تھے۔

یوسف: کسی محاذ پہ کوئی کمی!

جمیلہ: مشرقی محاذ پہ غذا کی کمی تھی مگر اب تک وہاں کافی خوراک جمع ہو گئی ہو گی۔ قبرستان والے محاذ پہ غذا اور ہتھیاروں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔

یوسف: حسنات نے کچھ کہا ہے!

جمیلہ: انہوں نے کہا تھا کل شام کے وقت ہسپتال کے پاس دشمن نے چھاؤنی بنا لی ہے اس کے علاوہ کچھ فاصلے پہ وہ دوسری چھاؤنی بھی بنا رہا ہے۔

یوسف: کہیں حسنات حملے کی تیاری تو نہیں کر رہا!

جمیلہ: میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ دو دن کے لیے انہوں نے حملہ روک دیا ہے۔

یوسف: اور کنوئیں کے پاس ابھی سپاہی ہیں کیا؟

جمیلہ: وہ میرے سامنے ہی کھیتوں میں جا کر چھپ چھپ کر آگے بڑھنے لگے تھے۔ شام تک مشرقی محاذ پہ پہنچ جائیں گے۔

یوسف: مرحبا! (شفقت سے جمیلہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہمارے لیے تو اللہ کی رحمت بن کر آئی ہے!

جمیلہ: اور حالات یہ ہیں (وقفہ) — عبدالکریم کو آپ کا نقشہ پہنچا دیا تھا۔ صادق کو بھی آپ کا رقعہ مل گیا تھا اور احمد سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ آج رات یہاں آجائے!

یوسف: ندی پہ مسلسل بمباری سے وہ نقشہ بیکار ہو گیا ہے جو عبدالکریم کو بھیجا گیا تھا۔ اب اس پہ عمل نہیں ہونا چاہیے۔

جمیلہ: تو اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟

یوسف: کیا کرنا چاہیے — (سوچتے ہوئے) کیا کرنا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ

وہاں سے الگ ہو کر نشیبی حصے میں پہنچ جائے۔

جمیلہ : جاتی ہوں!

یوسف : نہیں!

جمیلہ : کیوں قائد!

یوسف : ندی پر دشمن بمباری کر رہا ہے، ممکن ہے اس نے پُل بھی گرا دیا ہو۔
ندی کے پار کیوں کر جا سکو گی؟

فرحت : مجھے دوسرا راستہ معلوم ہے، جانے کی اجازت دیجئے!

حسن : میں تازہ دم ہوں قائد! یہ فرض میں ادا کروں گا!

عبداللہ : قائد! میں کل سے بیکار بیٹھا ہوں! یہ کام میرے ذمے کیوں نہیں کر
دیتے، آخر مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیئے!

جلیل : میں بھی عبداللہ کے ساتھ جاؤں گا۔

جمیلہ : یہ کام بہر حال میرا ہے۔ میں ہی کروں گی قائد!

عبداللہ : تم تھک چکی ہو جمیلہ! مسلسل کام کر رہی ہو!

جمیلہ : تھک چکی ہوں — تھکاوٹ کیا ہوتی ہے؟ میرے لیے تھکاوٹ صرف
میری موت ہی لے کر آئے گی!

یوسف : جمیلہ! عبداللہ درست ہی کہتا ہے۔ نہ تم رات کو آرام کرتی ہو نہ دن کو۔
دو تین روز تک تمہارا صرف یہ کام ہے کہ گودام کے اندر جا کر آرام کرو۔

جمیلہ : قائد! یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں رائفل لے کر میدان میں نہیں جا سکتی، اب
مجھے آپ اس سعادت سے تو محروم نہ کریں۔ میرا کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ میں ہی
کروں گی۔

یوسف : دیکھو —

جمیلہ: یہ فرض میرا ہے قائد! — (دروازے کی طرف جانے لگتی ہے) مجھی کو کرنا چاہیئے۔

عبداللہ: اسے روکیے قائد!

یوسف: میں نہیں روک سکتا — بڑھتا ہوا سیلاب کبھی نہیں رُک سکتا!

(جمیلہ دروازے سے نکل جاتی ہے)

عبداللہ: مجاہدہ ہو تو ایسی ہو۔

(یوسف سعدی اور باقی لوگ خاموش رہتے ہیں)

قائد! کیا اب بھی ہمارا وطن آزاد نہیں ہو گا؟

یوسف: آزاد ہو گا — ضرور ہو گا۔ الجزائر کے مجاہدوں کی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی!

(عبداللہ دروازے کی طرف دیکھتا ہے، دروازہ کھلا ہے، وہ ادھر بڑھتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ وہ دروازے تک پہنچ سکے، جمیلہ تیزی سے دروازے پر آتی ہے۔ سب کے سب اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔)

جمیلہ: دشمن

(جمیلہ جانے لگتی ہے)

یوسف: جمیلہ! — آؤ!

جمیلہ: نہیں۔

یوسف: تم —

جمیلہ: مجھے دشمن دیکھ چکا ہے۔ خدا کے لیے جلدی نکل جائیے۔

(جمیلہ اسی تیزی سے چلی جاتی ہے، کسی قدر دور سے شور بلند ہو

ہے، عبداللہ جلدی سے دروازہ بند کر دیتا ہے)

یوسف: (ساتھیوں سے) چلو!

عبداللہ: مگر جمیلہ!

یوسف: تم نکلو

(عبداللہ واپس آتا ہے۔ حسن رائفلیں اٹھا لیتا ہے، سب مشرقی دیوار کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ یوسف سعدی تیزی سے آگے بڑھ کر چٹائی ہٹا دیتا ہے

فرحت، حسن، عبداللہ اور جمیل یکے بعد دیگرے جلدی جلدی نکل جاتے ہیں۔ سب سے آخر میں یوسف سعدی بھی چلا جاتا ہے (

اب کمرہ خالی ہے۔

دور سے شور بلند ہوتا جا رہا ہے۔ اس شور میں قدموں کی آہٹ، گولیاں کی سنسناہٹ اور بار بار "وت" (VITE) کہتی ہوئی آواز آ رہی ہے۔

چند لمحوں کے بعد بھاری بھاری چیزوں سے دروازے کو توڑنے کی آواز مسلسل آنے لگتی ہے۔

دروازہ ٹوٹ کر گرتا ہے۔

فرانسیسی سپاہی اندر آتے ہیں اور کمرے میں ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں۔

جمیلہ فرانسیسی کیپٹن کے دھکے سے گرتی پڑتی کمرے میں آتی ہے اور مشرقی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

کیپٹن بھاگ کر آتا ہے، چٹائی پھاڑ ڈالتا ہے، سپاہیوں کو اشارہ کرتا ہے، یہ سپاہی اس کے ساتھ تہ خانے میں اترنے لگتے ہیں۔

دروازے سے چار اور فرانسیسی سپاہی اندر آتے ہیں ان کے ہاتھ میں
سنگینیں اور ریوالور ہیں۔

جمیلہ کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ اٹھ بیٹھتی ہے۔ انگلیوں سے
آنکھوں کی طرف بہتے ہوئے خون کو صاف کرتی ہے۔ کیپٹن باہر
آتا ہے۔ سپاہی بھی اس کے پیچھے آتے ہیں)

کیپٹن : (سپاہیوں سے) گھیرے میں لے لو اسے!

(سپاہی سنگینیں بڑھائے جمیلہ کے ارد گرد کھڑے ہو جاتے ہیں)

کہاں ہے یوسف سعدی!

جمیلہ : میں نہیں جانتی!

کیپٹن : تو نے ہمیں دیکھکر اسے بھگا دیا ہے۔

(کیپٹن جمیلہ کے بال زور سے کھینچتا ہے۔ درد کی شدت سے
جمیلہ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل جاتی ہے)

کہاں کہاں ہیں قیام گاہیں — بتاؤ!

جمیلہ : مجھے کیا خبر؟

کیپٹن : تجھے خبر نہیں! — تو جاسوس ہے۔ سب کچھ معلوم ہے تجھے، بتا — (گرج کر)
بتا۔ کہاں ہے یوسف سعدی۔

(جمیلہ خاموش کھڑی رہتی ہے)

کیپٹن : دیکھتا ہوں تو کس طرح نہیں بتائی۔ کہو (پاؤں زور سے زمین پر مار کر) کہو!

جمیلہ : وہ یہاں نہیں ہے۔

کیپٹن : یہاں نہیں ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ مگر میں پوچھتا ہوں، اس وقت
وہ کہاں ہے اور تم لوگوں کی باقی خفیہ گاہیں کہاں کہاں ہیں؟ — جواب دو۔ بولو!

جمیلہ : مجھے کچھ نہیں کہنا!
کیپٹن : تمہیں سب کچھ کہنا ہوگا۔ ابھی — اسی وقت — اسی لمحے!!!
جمیلہ : میں کہہ چکی ہوں!
کیپٹن : کیا؟
جمیلہ : مجھے کچھ نہیں کہنا!
کیپٹن : (جمیلہ کو شعلہ ریز نظروں سے دیکھ کر) لڑکی!
جمیلہ : فرمائیے کیپٹن صاحب!

(کیپٹن دو تین لمحے جمیلہ کو گھور کر دیکھتا رہتا ہے جیسے کوئی فیصلہ کر رہے ہو)

کیپٹن : (ذرا سنبھل کر) دیکھو اس وقت تم نادانی سے کام لے رہی ہو۔ تمہارے اس رویے کا انجام بہت برا ہے اور تم اس سے ناواقف ہو۔ سمجھتی ہو میں تمہیں زدوکوب کر کے قید خانے میں بند کر دوں گا۔ مگر ایسا نہیں ہوگا۔ سنا تم نے! ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔
جمیلہ : مجھے خبر ہے، موت نے اپنے سارے ہتھیار آپ کے سپرد کر دیے ہیں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔
کیپٹن : موت (حقارت انگیز قہقہہ لگا کر) فرانسیسی قانون موت کو بہت ادنیٰ سزا سمجھتا ہے۔ تم زندہ رہو گی مگر تمہاری زندگی کا ہر لمحہ موت سے ہزار درجہ بدتر ہوگا۔ موت کو چیخ چیخ کر پکارو گی۔ لیکن موت نہیں آئے گی۔ (گرج کر) موت نہیں آئے گی — اب کہو تمہارا کیا فیصلہ ہے؟
جمیلہ : (استقلال سے) وہی جو پہلے تھا۔
کیپٹن : (زور سے پاؤں زمین پر مارتا ہے) کیا کہا؟
جمیلہ : کہہ چکی ہوں۔

کیپٹن : میں تمہیں صرف پانچ لمحے دیتا ہوں - جو کچھ پوچھا گیا ہے - اس کا صاف جواب دو - اگر اس کے بعد بھی ضد کی تو یہ دنیا تمہارے لئے تاریک ہو جائے گی - ہمیشہ کے لئے ! سنا تم نے - تم کچھ بھی نہیں دیکھ سکو گی !

(جمیلہ کی پیشانی انگلی سے چھو کر)

اس ماتھے کے نیچے آنکھوں کی بجائے زخم بن جائیں گے — اور یہ چہرہ دھوئیں کی طرح سیاہ ہو جائے گا۔

(کیپٹن سپاہیوں کی طرف دیکھتا ہے - دو سپاہی سنگینوں کی نوکیں جمیلہ کی آنکھوں کی جانب لاتے ہیں - جمیلہ بدستور بڑے وقار کے ساتھ کھڑی ہے - کیپٹن سپاہیوں کو سنگینیں آنکھوں کے پاس روکنے کا اشارہ کرتا ہے - سنگینیں رک جاتی ہیں - کیپٹن جو ٹہل رہا ہے ایک دم رک جاتا ہے)

کیپٹن : کیا جواب ہے تمہارا

جمیلہ : میں کہہ چکی ہوں اور آپ سن چکے ہیں ۔

کیپٹن : تم اپنی ضد سے باز نہیں آؤ گی !

(کیپٹن جمیلہ کے بال زور سے کھینچتا ہے - جمیلہ درد کی شدت سے چیخ اٹھتی ہے)

نکال دو اس کی آنکھیں - خبیث کتیا

(اسی لمحے بریگیڈیر اور سپاہی آتے ہیں - کیپٹن بال چھوڑ کر سیلوٹ کرتا ہے - سپاہی مودب ہو جاتے ہیں)

بریگیڈیر : کیا ہو رہا ہے ؟

کیپٹن : یہی ہے وہ جاسوسہ - جمیلہ !

بریگیڈیر: جمیلہ

کیپٹن: وہی موسیو! — جاسوسہ

بریگیڈیر: تو —

(بریگیڈیر غور سے جمیلہ کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ ماحول کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر جمیلہ کو تیز تیز نظروں سے دیکھنے لگتا ہے)

تمہارا نام جمیلہ ہے (لہجے میں نرمی)

جمیلہ: یہی میرا نام ہے —

بریگیڈیر: ملٹری کا اصول ہے کہ جب، کوئی جاسوس گرفتار ہو جاتا ہے تو اس سے جو کچھ پوچھا جاتا ہے وہ صاف صاف بتا دیتا ہے۔

جمیلہ: یہ آپ کی ملٹری کا اصول ہے۔

بریگیڈیر: اور تمہاری ملٹری کا؟

جمیلہ: ہم غیر مہذب سپاہی ہیں۔ آپ کی مہذب ملٹری کے اصول نہیں جانتے۔

بریگیڈیر: (ذرا درشت لہجے میں) کیا مطلب؟ کیا تم جاسوسہ نہیں ہو؟

جمیلہ: جو بھی آپ سمجھ لیں!

بریگیڈیر: اور اس وقت تم ہماری حراست میں ہو۔

جمیلہ: میرا جسم آپ کی حراست میں ہے۔

بریگیڈیر: یہ تم مشرقی لوگ جسم اور روح کا کیا قصہ لے آتے ہو۔ روح کیا چیز ہے؟

جمیلہ: وہ چیز جسے آپ کی ساری طاقت بھی گرفتار نہیں کر سکتی۔

بریگیڈیر: یہ تمہاری روح ہے۔

جمیلہ: یہ الجزائر کی روح ہے۔

بریگیڈیر: الجزائر (حقارت انگیز قہقہہ لگاکر) ہمارے قدموں میں گرا ہوا ایک زخمی کتا۔

جمیلہ: (غصے سے) بریگیڈیر! آپ میرے مقدس وطن کی توہین کر رہے ہیں!

بریگیڈیر: یہ توہین ہوتی رہے گی!

جمیلہ: نہیں ہو سکتی!

بریگیڈیر: تم کون ہو ہمیں روکنے والی!

جمیلہ: الجزائر کی ایک ادنیٰ بیٹی۔

بریگیڈیر: (میز پر زور سے مکا مار کر) کیا شور مچا رہی ہو (کرسی سے الگ ہو کر) تم جاسوس ہو۔ جو کچھ پوچھا جائے صاف صاف بتاؤ!

جمیلہ: یہ بات پہلے بھی مجھ سے ایک بار نہیں کئی بار کہی جا چکی ہے۔ اور ——

بریگیڈیر: اور؟

جمیلہ: میرا جواب جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے۔

بریگیڈیر: یہ انکار تمہاری زبان کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جسم کے ایک ایک ریشے سے کس طرح جواب لیا جاتا ہے، بتاؤ کیا کہتی ہو تم،

جمیلہ: کہہ چکی ہوں!

بریگیڈیر: تمہیں آخری بار موقع دیا جاتا ہے، باغیوں کی خفیہ قیام گاہیں بتاؤ۔ ہم تمہیں الجزائر کی سب سے دولت مند عورت بنا دیں گے۔

(جمیلہ خاموش رہتی ہے)

خاموش کیوں ہو؟

جمیلہ: میرے لیے سب سے بڑی دولت میرے وطن کی آزادی ہے۔

بریگیڈیر: گویا تم ذلیل ہو کر مرنا چاہتی ہو۔

جمیلہ: آزادی کے لیے مجھے ہر موت قبول ہے۔

(بریگیڈیر اسے گھور کر دیکھتا ہے)

بریگیڈیر: (کیپٹن سے) لے جاؤ اِسے۔ ذِلّت کی موت مارنے کے لیے۔ لے جاؤ فوراً۔

(سپاہی جمیلہ کے چاروں طرف سنگینیں تان لیتے ہیں۔ ان کے سائے میں جمیلہ دروازے کی طرف قدم اُٹھانے لگتی ہے۔ کیپٹن بھی جا رہا ہے۔ بریگیڈیر وہیں کھڑا رہتا ہے)

کیپٹن!

(جمیلہ دروازے سے نکل چکی ہے۔ کیپٹن آتا ہے)

تم سمجھتے ہو جمیلہ سزا سے خوفزدہ ہو جائے گی؟

کیپٹن: میں ایسا ہی سمجھتا ہوں موسیو!

بریگیڈیر: میں ایسا نہیں سمجھتا!

کیپٹن: وہ درست ہو جائے گی۔

بریگیڈیر: سنو! اسے انتہائی لالچ دو۔ اس کے بغیر سزا۔ مگر دیکھنا اسے مارنا نہیں اِسے زندہ رہنا چاہیئے۔

کیپٹن: سمجھتا ہوں!

بریگیڈیر: کیس ملٹری میں جائے گا

کیپٹن: موسیو!

بریگیڈیر: گواہ ہوں گے؟

کیپٹن: ہمارے کیمپ میں جو عورت ناچا کرتی تھی وہ گواہی دے سکتی ہے۔ اس کا باپ بھی وہی بات کہہ دے گا جو ہم اس سے کہلوانا چاہیں گے!

بریگیڈیر: مگر وہ تو —

کیپٹن : فرمایئے موسیو!

بریگیڈیر : وہ دونوں نیم دیوانے تو نہیں ہو گئے کیا! خیر دیکھا جائے گا۔ دیکھا جائے گا۔

(بریگیڈیر باہر جانے لگتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

پردہ اٹھتا ہے تو فوجی عدالت سامنے آتی ہے
میز کے اس طرف ایک فرانسیسی جنرل بیٹھا ہے۔ پاس بریگیڈیر نظر آرہا ہے۔
بریگیڈیر کے آگے سفید کاغذ اور فونٹن پن ہے۔
میز کے اردگرد سپاہی کھڑے ہیں۔

میز کی دوسری جانب جمیلہ کھڑی ہے۔ شانے پہ پٹی بندھی ہوئی، چہرے پر حسب معمول تابناکی، وقار اور جلال۔ جمیلہ کے پاس ایک چینی شکل کا آدمی بھی کھڑا ہے)

جنرل : (چینی سے) تم کون ہو؟

چینی : ملزمہ کا وکیل۔

جنرل : مجرمہ کا وکیل، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ایک مجرم کی مدد کرنا بھی جرم سے کم نہیں!

چینی : جنرل! مجھے یہ تو معلوم نہیں البتہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ دنیا کی ہر عدالت ملزم کو قانونی سہولتیں بہم پہنچانا اپنا فرض جانتی ہے۔

جنرل : اگر باغیوں کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کو گرفتار کیا جا سکتا ہے تو آخر ان کے

وکیلوں کو کیوں معاف کیا جائے ؟

چینی : جناب! عدالت جو چاہے کرے ۔ ویسے انصاف کا تقاضا یہی ہے اور دنیا کی ہر عدالت ملزم کو قانونی سہولت دیتی ہے ۔

جنرل : (غصے سے) انصاف کیا ہے اور کس طرح کیا جاتا ہے یہ ہم جانتے ہیں ۔ تم لوگ نرے احمق ہو!

چینی : میں معافی کا خواستگار ہوں جناب! مگر —

جمیلہ : مجھے وکیل کی ضرورت نہیں ۔ میں اپنی وکالت خود کروں گی!

(چینی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر جمیلہ اسے جانے کے لیے اشارہ کرتی ہے ۔ چینی جانے لگتا ہے ۔ بریگیڈیئر فونٹین پن لے کر کاغذ پر جھک جاتا ہے)

جنرل : تمہارا نام جمیلہ ہے؟

جمیلہ : جی ہاں!

جنرل : تم پر تین جرم عائد ہوتے ہیں ، پہلا جرم یہ ہے کہ تم نے اس ملک کے امن و امان کو برباد کرنے کی کوشش کی ہے ۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ تم نے باغیوں کی جاسوسی کی ہے اور تیسرا — جرم یہ ہے کہ تم نے راستے میں دو بم رکھے تھے ۔

جمیلہ : جناب! پہلے جرم کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اس ملک میں امن و امان کو میں اور میرے ساتھی نہیں ، وہ لوگ برباد کر رہے جنہیں ہمارے ملک سے کوئی ہمدردی نہیں اور جو ہمارے ہاتھوں میں غلامی کی زنجیریں پہنا رہے ہیں — آزادی کی جنگ کرنے والوں کی مدد کرنا کوئی جرم نہیں ۔ اُسے وہی لوگ جرم کہتے ہیں جو آزادی کے فطری جذبے کو کچل دینا چاہتے ہیں ۔ تیسرے الزام سے میں انکار

کرتی ہوں۔

جنرل: تم نے راستے میں بم نہیں رکھے تھے؟

جمیلہ: نہیں

جنرل: دیکھنے والوں نے تمہیں خود اپنی آنکھوں سے بم رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔

جمیلہ: اس الزام میں مطلقاً کوئی صداقت نہیں۔

جنرل: اور دیکھنے والوں نے کیا دیکھا ہے؟

جمیلہ: جو کچھ انھیں سنگینوں کے سائے میں دکھایا گیا ہے۔

جنرل: (گرج کر) سنگینوں کے سائے میں؟ — کیا مراد ہے تمہاری؟

جمیلہ: آپ جانتے ہیں۔

جنرل: (ایک سپاہی سے) گواہ لاؤ!

(سپاہی مشرقی دروازہ سے باہر نکل جاتا ہے اور جب واپس آتا ہے
تو اس کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی آتا ہے۔
وہ شخص کانپ رہا ہے
سپاہی اسے ایک طرف کھڑا کر دیتا ہے)

تمہارا نام؟

گواہ: جی — اسمٰعیل

جنرل: (جمیلہ کی طرف اشارہ کر کے) اس کے متعلق کیا جانتے ہو!

گواہ: جی — جی!!

جنرل: اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟!

گواہ: جو — جو — آپ چاہتے ہیں — جی دبی — جو جو —

(جنرل بوڑھے کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ بوڑھا تھرتھر

کانپ رہا ہے۔ جنرل سپاہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سپاہی اس کا بازو پکڑ کر لے جاتا ہے۔

چند لمحوں کے بعد سپاہی کے ساتھ ایک عورت آتی ہے، لباس
پھٹا پرانا، بال بری طرح بکھرے ہوئے۔ جیسے ان میں کبھی کنگھی
کی ہی نہیں کی گئی

سپاہی اُسے ٹھیک اُس جگہ کھڑا کر دیتا ہے جہاں پہلے بوڑھا
کھڑا تھا)

جنرل: (عورت سے) تمہارا نام بھی جیلو ہے؟

(عورت اثبات میں سر ہلا دیتی ہے)

اس لڑکی (جیلو کی طرف اشارہ کرکے) کے بارے میں کیا جانتی ہو؟

(عورت خاموش رہتی ہے)

بتاؤ۔ خاموش کیوں ہو؟ تمہارے سامنے اس نے راستے میں بم رکھے تھے؟

عورت: ہاں — ہاں ہاں!!

جنرل: ہاں ہاں!

عورت: ہاں ہاں!

جنرل: کب رکھے تھے؟

عورت: پرسوں — نہیں کل — نہیں آج — جی آج!!

جنرل: (سپاہی سے) لے جاؤ!

(سپاہی عورت کا ہاتھ پکڑ کر زور سے اسے اپنی طرف کھینچتا ہے
عورت رونے لگتی ہے۔ سپاہی اُسے زبردستی گھسیٹ کر لے
جاتا ہے)

جرم تینوں ثابت ہو گئے ہیں۔

جمیلہ : اس طرح دنیا کا ہر جرم ہر اس شخص پر ثابت ہو سکتا ہے جو اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہے۔

جنرل : خاموش رہو۔

(جنرل بریگیڈیر کی طرف دیکھتا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے جنرل کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ جنرل اس پر سرسری نظر ڈالتا ہے۔ اور ایک جگہ جلدی جلدی کچھ لکھ دیتا ہے)

تم تین جرموں کی مرتکب ہو اور ان میں سے ہر جرم کی سزا موت ہے۔ یہ عدالت تمہاری موت کا حکم سناتی ہے۔

جمیلہ : میں موت کا خیر مقدم کرتی ہوں، مگر پھانسی کے تختے کی طرف جانے سے پہلے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں — میں کہنا چاہتی ہوں

(ذرا وقفہ)

کہ فرانس ایک بہت بڑا مہذب ملک تھا۔ اس ملک نے دنیا کی تہذیب و تمدن میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کے انقلابیوں نے اپنے جابر حکمرانوں کا دامن ستم چاک چاک کر دیا تھا۔ اس کے بہادر باغیوں نے اُن آہنی دروازوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا جن کے پیچھے بدنصیب قیدی سسک سسک کر مر رہے تھے۔ یہ فرانس ہی تھا جس نے دنیا کو روشنی اور آزادی کا ایک نیا پیغام دیا تھا — مگر آج وہ فرانس ختم ہو چکا ہے — وہ فرانس مر چکا ہے — آج وہ فرانس انسانی درندوں کا وطن بن گیا ہے۔ آج فرانس ظلم و ستم کے گہوارے کے سوا اور کچھ نہیں رہا!

آج فرانسیسی سپاہی ایک امن پسند ملک کو اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں۔

آزادی اور روشنی دینے والا فرانس الجزائر کے سینے میں غلامی کے داغ لگا رہا ہے
اس کی آنکھوں کی روشنی اپنے زہریلے سانسوں سے بجھا رہا ہے۔
میں انصاف کی دہلیز پر کھڑے ہو کر پوچھتی ہوں کہ فرانس الجزائر کو کیوں اپنا
غلام بنانا چاہتا ہے — فرانس کو دنیا کے کس قانون نے یہ اختیار دیا ہے کہ
وہ الجزائر کے نہتے انسانوں پر گولیاں برسائے اور ان کا سب کچھ چھین لے!
میرے جرم کا فیصلہ کرنے سے پہلے کاش آپ نے اپنے خون آلود ہاتھوں اور
خونخوار سنگینوں کو تو دیکھ لیا ہوتا شاید آپ کا ضمیر بیدار ہو جاتا — میں فرانس
کے انسانی ضمیر سے مایوس نہیں ہوں!

جنرل: لڑکی! ہم تمہاری یہ بکواس سننے کے لئے یہاں نہیں آئے!

جمیلہ: میں جانتی ہوں آپ کا فیصلہ کیا ہو گا مگر یہ فیصلہ سننے سے پہلے مجھے جو کچھ کہنا
ہے وہ ضرور کہوں گی — مجھے اپنے وطن سے محبت ہے اور میں اسے آزاد
دیکھنا چاہتی ہوں! اور فقط اسی جرم کی پاداش میں آپ کے سپاہیوں نے
مجھ پر متواتر ظلم کیا ہے۔ میں یہاں کس کس ظلم کا ذکر کروں۔ میرے کپڑے اتارے
گئے، مجھے بنچ کے ساتھ ایک گیلے کپڑے سے باندھا گیا۔ متواتر دوپہر تک میرے
جسم کے نہایت نازک مقامات پر بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ مجھے ہر وہ سزا دی
دی گئی جس کا تصور درندہ وحشت کا انسان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم اپنے وطن
میں کسی کو ستائے بغیر عزت و آبرو کی زندگی چاہتے ہیں۔ مگر آپ چاہتے ہیں
کہ ہم اپنی زمین کی دولت، اپنے بیٹوں کی عزت و جوانی اور اپنی بیٹیوں
کا ننگ و ناموس آپ کے حوالے کر دیں۔ یہ ہمیں منظور نہیں اور نہ کبھی ہو گا!

جنرل: بند کرو اپنی بکواس۔ تم عدالت کی توہین کر رہی ہو!

جمیلہ: آپ کے سپاہیوں نے مجھے ننگا کر کے مارا ہے مگر یاد رکھو تم نے الجزائر کی ایک

بیٹی ہی کو ننگا نہیں کیا، اپنی صاف ستھری تہذیب کو بھی عریاں کر دیا ہے۔

جنرل: خاموش!

جمیلہ: اپنی تہذیب پر اتراتے ہو۔ آؤ دیکھو آج تمہاری تہذیب ہماری لاشوں کے اوپر وحشیانہ ناچ ناچ رہی ہے۔ وہ دیکھو تمہارا تمدن الجزائر کی تنگ و تاریک گلیوں میں بے گناہوں کی موت پر شیطانی قہقہے لگا رہا ہے — وہ دیکھو تمہاری شاندار روایات، ہمارے معصوم بچوں کے لہو سے اپنے خوبصورت ہاتھ رنگ رہی ہے۔

جنرل: (میز پر زور سے مکا مار کر) لے جاؤ اس خبیث کتیا کو پھانسی کے تختے پر۔

(سپاہی سنگینیں تانے جمیلہ کی طرف بڑھتے ہیں)

جمیلہ: جمیلہ کی آواز بند کر سکتے ہو مگر یہ نہ بھولو آج الجزائر کے ہر گھر میں ایک جمیلہ پیدا ہو چکی ہے — آج ہر گھر جنگِ آزادی کا محاذ بن گیا ہے۔ آج ہر گھر سے آزادی کا پرچم بلند ہو رہا ہے۔

(سپاہی سنگینیں چبھوتے ہوئے جمیلہ کو لے جانے لگتے ہیں۔ جمیلہ بلند آواز میں کہتی ہے)

الجزائر زندہ باد! — آزاد الجزائر پائندہ باد!! (پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر

(جمیلہ کے گھر کا وہی کمرہ جو دوسرے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ قاسم کا پرچم مینٹل پیس پر پڑا ہے۔ جمیلہ کی ماں ایک کرسی پر بیٹھی ہے میز پر کہنیاں ٹکی ہیں اور ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ چھپا ہوا ہے۔ کانپتے ہوئے جسم سے معلوم ہوتا ہے کہ سسکیاں بھر رہی ہے۔

دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ ماں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔

دستک دوبارہ ہوتی ہے۔ ماں چہرے سے ہاتھ اٹھا کر دروازے کو دیکھتی ہے۔ اٹھتی ہے۔ انگلیوں سے آنسو خشک کرتی ہے اور دروازے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔

دروازہ کھولتی ہے۔ دروازے پر جمیلہ نظر آتی ہے۔ سخت مغموم حالت میں)

ماں : جمیلہ!

(جمیلہ چپ چاپ اندر آنے لگتی ہے۔ ماں اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے)

کیا ہوا میری بچی!

جمیلہ : امی! میں بہت بد نصیب ہوں

(آنکھیں اشک آلود ہو گئی ہیں)

ماں : ہوا کیا ہے؟

جمیلہ : میں شہادت سے محروم ہو گئی ہوں امی! فرانسیسی حکومت نے عین وقت پر پھانسی کا حکم منسوخ کر دیا۔ اور میری شہادت کی آرزو ۔۔ آرزو ہی رہی۔

ماں : تو اس میں مغموم ہونے کی کیا بات ہے؟

جمیلہ : یہ بدقسمتی نہیں امی کہ مجھے شہادت نہیں مل سکی۔ میں پھانسی کی رسّی کو چوم ہی نہیں سکی!

(وقفہ)

ماں : جمیلہ!

جمیلہ : جی امی!

ماں : تجھے مغموم نہیں ہونا چاہیئے۔ بالکل نہیں ہونا چاہیئے میری بچی! ۔ ابھی ہمارا وطن غلامی کی زنجیروں سے گراں بار ہے۔ ابھی آزادی کی منزل دُور ہے۔ وہ دیکھ۔

(دینتل پیس پر رکھے ہوئے پرچم کی طرف اشارہ کرتی ہے)

وہ پرچم ابھی سرنگوں ہے یہ پرچم ابھی آزاد الجزائر پر نہیں لہرایا۔ تو پھانسی کی رسی کو نہیں چوم سکی تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تو آزاد الجزائر کے مقدس پرچم کو چومے گی۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ جب یہ پرچم ہمارے سروں کے اوپر آزادی کا پیغام بن کر اپنے بازو پھیلا دے گا — اور ہم — میں — تو — الجزائر کے سب لوگ اس کے سائے میں کھیں گے — آزاد الجزائر زندہ باد — آزاد الجزائر پائندہ باد!

(ماں فضا میں دیکھ رہی ہے۔ جمیلہ ماں کو ٹکٹکی باندھے تک رہی ہے۔ اس کا چہرہ ایک نئے عزم اور نئے جوش سے چمکنے لگا ہے اور اسی عالم میں پردہ گرتا ہے)

فاطمہ برناوی

سرزمینِ فلسطین کی زندہ جاوید مجاہدہ

کردار

سلمان غنی ——— ایک فلسطینی معلم

عمارہ ——— سلمان غنی کی بیوی

ذکیہ ——— ان کی بیٹی

فاطمہ ——— فلسطین کی بہادر اور جاں سپار لڑکی
تحریک الفتح کی روح رواں

سہیل ——— تحریک الفتح کا ایک راہنما

یہودی کیپٹن فردغی

یہودی کرنل جواد اور دو یہودی سپاہی

نعمان اور حاکم

پہلا منظر

فلسطین ـــــ میں ایک بستی اَلقُدس کے نواح میں
سلمان غنی کا امکان !

(سلمان باہر سے مکان میں آتا ہے)

سلمان : (بلند آواز میں) عمارہ کہاں ہو تم عمارہ !

عمّارہ : (کچھ فاصلے سے) مَیں یہاں ہوں باورچی خانے میں۔

سلمان : وہاں کیا کر رہی ہو؟ میرے پاس آؤ۔

عمّارہ : قہوہ نہیں پیئیں گے

سلمان : نہیں۔ اِدھر آجاؤ

(عمارہ آتی ہے)

عمارہ : آپ اتنی جلدی پریشان کیوں ہو جاتے ہیں ؟۔

سلمان : پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔ آج صبح سے یہودی سپاہیوں کی چاپ سن رہا ہوں۔
وہ اِدھر گشت لگا رہے ہیں۔

عمّارہ : مَیں نے دو تین بار دروازہ کھول کر باہر دیکھا تھا۔ کوئی نہیں تھا

سلمان : تم نے دروازہ کیوں کھولا تھا اور یہ ذکیہ کہاں ہے۔ کافی دیر سے اسے مَیں نے دیکھا نہیں ہے۔ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ بلاؤ اُسے (پکارتے ہوئے) ذکیہ ! ذکیہ !!

عمارہ: کئی مرتبہ آپ سے کہا ہے کہ بچی کو اس طرح نہ پکارو۔ آج کل تو ہوا کے جھونکے پر بھی یہ خدشہ ہوتا ہے کہ کوئی نئی آفت نہ نازل ہو جائے۔

سلمان: عمارہ تم جانتی نہیں ہو۔ یہ ہماری بدبختی اور نکبت کا دور ہے۔ ہماری زندگی موت کے طویل سایوں میں سسک رہی ہے۔ ہم اللہ کے مقہور بندے ہو گئے ہیں۔

عمارہ: آپ کی یہ باتیں بہت اذیت ناک ہیں۔

سلمان: میری باتیں بہت اذیت ناک ہیں۔ کیونکہ یہ زندگی کی اذیت ناک حقیقت کا اظہار کرتی ہیں۔ اذیت کے بعد پھر اذیت۔ لیل و نہار یونہی گزرتے ہیں۔ ہر نیا دن ایک نئی مصیبت لے کر آتا ہے۔ اور ہر نئی رات ایک تازہ زخم لگاتی ہے۔ فلسطین، میرا فلسطین — ہم سب کا فلسطین کبھی زندہ تھا۔ آج یہودیوں کے ظلم و جور میں جکڑ کر لہو کے آنسو بہا رہا ہے اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہر روز یہ منظر دیکھیں اور دیکھتے دیکھتے مر جائیں۔

عمارہ: پھر وہی ماتم!

سلمان: ماتم؟ (جنون انگیز قہقہہ لگا کر) ہمیں ماتم کے سوا اب اور کرنا ہی کیا ہے۔ ماتم! اپنے اس ماضی کا ماتم جو جاہ و جلال کے لاکھوں آفتاب لے کر سارے فلسطین پر چھا گیا تھا اور اس سرزمین کا ذرہ ذرہ روشنیوں سے منور ہو گیا تھا۔ آج وہ سب کے سب آفتاب تاریکیوں کے اتھاہ سمندر میں دفن ہو گئے ہیں۔ کہیں بھی روشنی کی ایک کرن تک باقی نہیں رہی۔ تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔ جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ تم دونوں مجھے پاگل سمجھتی ہو۔ اور شاید میں پاگل ہوں بھی!

عمارہ: نہیں میں ایسا نہیں سمجھتی۔

سلمان غلط کہہ رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر پھیلے ہوئے مایوسی کے اثرات صاف ظاہر کرتے ہیں کہ تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہو۔ اور ٹھیک ہی سمجھتی ہو۔ میں نے عقل و خرد کا سارا اثاثہ گنوا دیا

دیا ہے اور یہ اثاثہ اس وقت گنوایا تھا جب ظالم یہودی میرے لختِ جگر کو یہاں سے گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

عمارہ: یہودی کتوں نے گرفتار کرتے وقت اس پر کتنا تشدد کیا تھا مگر میرے بہادر بچے کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نہیں نکلی تھی۔

سلمان: اُس کے منہ سے کوئی چیخ نہیں نکلی تھی لیکن میرا دل ڈوب گیا تھا۔ اور یہ مظلوم دل اب تک اسی طوفان میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ تم نہیں جانتیں عمارہ! مجھ پر ان لمبے دنوں اور لمبی راتوں میں کیا کیفیت گزرتی رہتی ہے۔ میرا ایک ایک لمحہ جہنم کی آگ میں پگھل رہا ہے۔ پناہ رب الرحیم۔

عمارہ: میں جانتی ہوں۔ مجھے کس چیز کا علم نہیں ہے؟

سلمان: تم کیا جانو! تم کیا جان سکتی ہو! آج جب میں گھر سے باہر نکل کر ذرا دُور گیا اور میری آنکھوں نے اس یہودی قالین فروش کی دکان کے سامنے سرخ خاک کو دیکھا جہاں میرے بچے کو بے دردی سے ذبح کیا گیا تھا تو یوں لگا جیسے میرے سینے میں ایک شگاف ہو گیا ہے اور اندر کا سارا لہو باہر آ رہا ہے۔ یہ سرخ خاک ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتی ہے۔ کسی وقت بھی اوجھل نہیں ہوتی۔ عمارہ اس دن بھی صبح سے مجھے یہودیوں کی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور آج بھی میں یہ چاپ سُن رہا ہوں۔ میری ذکیہ کہاں ہے؟

عمارہ: ذکیہ کمرے کے اندر کوئی کام کر رہی ہے۔

سلمان: وہ گھر سے باہر تو نہیں گئی؟۔

عمارہ: باہر کیا کرنے جائے گی؟۔

سلمان: عمارہ! کیا اس وسیع کائنات میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں میں تم اور میری بچی تینوں جا کر آباد ہو جائیں اور فراموشی کا ایک گہرا پردہ ہمارے حواس پر چھا جائے ہمیں کچھ بھی یاد نہ رہے ہم سب کچھ بھول جائیں۔

عمارہ : ہم فلسطین سے نہیں جائیں گے۔ فلسطین ہمارے آباؤ اجداد کا وطن ہے اور ہمارے بعد ہماری اولاد کا وطن ہوگا۔

سلمان : یہ خوش فہمی ہے جس طرح آج سے صدیوں پہلے اہلِ روما نے یہودیوں کو یہاں سے جلاوطن کر دیا تھا۔ اس طرح یہ بدبخت یہودی ہمیں نکال دیں گے اور ہم نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھریں گے۔

عمارہ : نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ آپ مایوس ہو گئے ہیں تو آپ انتہائی یاس کے عالم میں یہ لفظ کہہ رہے ہیں۔ فلسطین ہمارا ہے۔ ہم فلسطین کے ہیں۔

سلمان : میں مایوس کیوں نہ ہوں۔ میں فلسطین کے مسلمانوں کی تقدیر کو دبے پاؤں آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تقدیر لہولہان ہے۔ اس سے لہو بہہ رہا ہے اور اسی لہو میں ہمیں بہہ جانا ہے آج یا کل۔ چند روز کے اندر اندر۔

عمارہ : ہمیں اگر لہو ہی میں بہہ جانا ہے تو یہیں رہیں گے۔ اور اسی خاک میں مل جائیں گے۔

سلمان : کاش ہم کسی اجنبی جزیرے میں چلے جائیں۔

عمارہ : آپ کے بچے نے اس وطن کی آزادی کے لیے جان قربان کر دی اور آپ یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔

سلمان : میرے بچے کے سر میں ایک خوفناک قسم کا سودا سما گیا تھا۔ وہ اور اُس جیسے شوریدہ سر نوجوان بے سود کوشش کر رہے ہیں۔ اب فلسطین پہ وہ سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا۔ جسے یہودی ظلم و تشدد کی اندھی رات نگل گئی ہے۔

عمارہ : آپ نے تو مایوسی کی انتہا کر دی ہے۔

سلمان : عمارہ! یہ دیکھو۔ سُنو! سُنو۔ یہ چاپ۔ یہ چاپ!

عمارہ : باہر فوجی پھر رہے ہیں۔ اور آج کل یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر روز پھرتے رہتے ہیں۔

سلمان : اتنی بلند اور متواتر چاپ پہلے کہاں سنائی دی تھی؟

عمارہ : میں تو ہر روز سنتی رہتی ہوں۔

سلمان : ذکیہ کو اب تک کیوں نہیں بلایا ؟

عمارہ : کہہ تو رہی ہوں وہ کمرے کے اندر کوئی کام کر رہی ہے۔

سلمان : اسے بلاؤ۔ میں خود بلاتا ہوں۔

عمارہ : آپ نہیں رہیں میں اسے بلا لاتی ہوں۔

(عمارہ کمرے سے نکل جاتی ہے اور جب واپس آتی ہے تو اس کے ساتھ

ذکیہ بھی ہے !)

ذکیہ : جی ابّو ! فرمایئے !

سلمان : میری بچی ! تو کہاں چلی گئی تھی۔ یہاں آجا میرے پاس !

ذکیہ : فرمایئے

سلمان : مجھے کچھ نہیں کہنا میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کل چند دیوانے نوجوان

یہاں آئے تھے۔

ذکیہ : ہاں آئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا ہم جبار کا انتقام ضرور لیں گے۔

سلمان : انتقام ! کس سے انتقام لیں گے۔ اس قوت سے انتقام لیں گے جسے دنیا کی عظیم

طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے جس نے ہم سب کو حقیر تنکوں کی طرح منتشر کر دیا

ہے۔ میں نے منع کر دیا تھا کہ یہ لوگ یہاں نہ آیا کریں۔ انہوں نے میرے لختِ جگر

کو مجھ سے چھین لیا اب کیا لینے آتے ہیں۔ میری ذکیہ کو بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔

ذکیہ : ابا ! اگر کسی دن میرے وطن نے مجھے بلایا تو.......

سلمان : نہیں تم نہیں جاؤ گی۔ تم نہیں جاؤ گی۔ میں ان کو یہاں آنے سے روک دوں گا۔

(سلمان کمرے سے باہر جانے لگتا ہے)

عمارہ : آپ چلے کہاں ؟

سلمان : میں وہاں جا رہا ہوں جہاں یہ پاگل نوجوان جمع ہوتے ہیں۔

عمارہ : مت جایئے۔ رک جایئے۔

سلمان : مجھے جانے دو۔ میں انہیں روک دینا چاہتا ہوں۔

ذکیہ : ابا نہ جایئے! کیوں جاتے ہیں آپ ؟ ابا۔ ابا !!

سلمان : میں ضرور جاؤں گا ذکیہ ! یہ جنونی نوجوان یہاں آتے رہتے ہیں۔ اسی لیے یہودی سپاہی کئی دن سے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں، میرے گھر کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی وقت بھی ہمیں گرفتار کر لیں گے۔

ذکیہ : امّی ابا کو کیا ہو گیا ہے

(سلمان تیزی سے نکل جاتا ہے)

عمارہ : بیٹی ! مایوسی نے ان کی سوچنے سمجھنے کی قوت مسلوب کر لی ہے۔ انہیں ہر طرف بے رحم اسرائیلی ہی نظر آتے رہتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو یہ کیا سمجھائیں گے ؟ کیا کہیں گے ان سے ؟ یہودیوں کے ظلم کے خلاف بغاوت نہ کرو، فلسطین کی آزادی کا خیال دل سے نکال دو! وہ کب سنیں گے ان کی باتیں، آج فلسطین میں کون ایسا مسلمان گھرانہ ہے جہاں انقلاب کا الاؤ روشن نہیں ہے۔

ذکیہ : امّی جب ہمارے گروہ کے آدمی ابا کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے شرم آنے لگتی ہے۔

عمارہ : بعض لوگ صدمے سے شکست کھا کر اپنے حواس کھو دیتے ہیں۔ ان کے ضمیر کا شعلہ بجھ جاتا ہے اور کچھ لوگ انتقام پر اتر آتے ہیں اور جب تک انتقام نہ لے لیں صبر نہیں کرتے۔ تیرے بھائی کی شہادت نے تیرے باپ کو انتہائی طور پر ناامید کر دیا ہے اور ان کے اندر کی آگ بجھ گئی ہے۔

(دور گولیاں چلنے کی آواز)

ذکیہ : آج پھر بے درد یہودی غریبوں کی جان لے رہے ہیں۔

عمارہ : اور دیکھو، اُدھر دھواں پھیل رہا ہے۔

ذکیہ : نہ جانے کس غریب کے گھر کو آگ لگائی گئی ہے۔

عمارہ : ہر جگہ خون اور آگ ہے۔ ہمارا فلسطین جل رہا ہے۔ پامال ہو رہا ہے۔ تباہ ہو رہا ہے۔

(دروازے پر دستک)

ذکیہ : کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

عمارہ : تم اُدھر چلی جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں۔

(فاطمہ آتی ہے)

فاطمہ : کیا مجھے اس گھر میں پناہ مل سکتی ہے؟

عمارہ : ...... تم ......؟

فاطمہ : میں فاطمہ ہوں۔

عمارہ : اندر آجاؤ۔

ذکیہ : میرے ساتھ آئیے۔

فاطمہ : یہودی سپاہیوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ بچ کر بھاگتی ہوئی اِدھر آگئی ہوں۔

(ذکیہ فاطمہ کو دوسرے دروازے کے پاس لے جاتی ہے)

ذکیہ : اس زینے پر قدم رکھیے اور نیچے اتر جائیے۔ روپوش ہونے کے لیے یہ اچھی جگہ ہے۔

فاطمہ : ممکن ہے وہ ۔گ اِدھر آئیں اور میرے بارے میں پوچھیں۔

ذکیہ : آپ بالکل بے فکر ہو جائیں وہ آئیں گے تو ہم ان کی باتوں کا جواب دے لیں گے۔

(ذکیہ اور فاطمہ سیڑھیوں سے نیچے اتر جاتی ہیں)

عمارہ دروازہ بند کر دیتی ہے)

عمارہ : (مدھم لہجے میں) ذکیہ۔

ذکیہ : (نیچے سے) جی امی

عمارہ : اب نکل آؤ۔

(ذکیہ واپس آجاتی ہے)

سلمان: (باہر سے) عمارہ! دروازہ کھولو!

ذکیہ: امی! آپ ابا سے بالکل نہ کہیں کہ فاطمہ یہاں چھپی ہوئی ہے۔

عمارہ: تمہارے ابا کو یہ بات کیونکر بتائی جا سکتی ہے؟

(سلمان آتا ہے)

سلمان: آج تو یہودی ہمارے محلے کو میدانِ جنگ بنا دینا چاہتے ہیں۔ چاروں طرف مسلح سپاہی گھوم رہے ہیں۔ مجھے انہوں نے آگے جانے سے روک دیا ہے۔ یہ سیاہی کیسی ہے ہمارے گھر کے اوپر؟

عمارہ: دھوئیں کے بادلوں کی ہے۔

سلمان: آگ اور خون کا کھیل ہر جگہ کھیلا جا رہا ہے۔

(دروازے پر ایسا شور جیسے اس پر مکے برسائے جا رہے ہیں)

اوہ خدائے قدوس! میرے ننگ و ناموس کی حفاظت کر! عمارہ ذکیہ کو لے کر دوسرے کمرے میں چھپ جاؤ۔

(عمارہ دوسرے دروازے کے پیچھے چلی جاتی ہے

بیرونی دروازے پر دستک کا شور دوچند ہو جاتا ہے)

کون ہے؟

کیپٹن فرعون: (گرج کر) دروازہ کھولو۔

سلمان: کھولتا ہوں۔

(سلمان جا کر دروازہ کھولتا ہے۔ یہودی کیپٹن فرعون آتا ہے)

کیپٹن فرعون: دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی ہے؟

سلمان: کیپٹن صاحب! میں معمر آدمی ہوں۔ ضعیف انسان شور سن کر گھبرا جاتا ہے۔

کیپٹن فرعون: میں کیپٹن فرعون ہوں۔

سلمان : مجھے معلوم ہے۔

کیپٹن فروغی : کیسے معلوم ہے؟

سلمان : یہ نہ پوچھیے میرے بچے کو آپ ہی لے گئے تھے۔

کیپٹن فروغی : تم اس پاگل جبار کے باپ ہو جسے اس روز قتل کیا گیا تھا؟

سلمان : مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے بچے نے ایک غیر مناسب حرکت کی تھی۔

کیپٹن فروغی : وہ اُن بیوقوف لوگوں کے ساتھ مل گیا تھا جو جا بجا تخریبی سرگرمیوں سے اس ملک کا امن و امان تباہ کر رہے ہیں مگر امن و امان کے ایک ایک دشمن کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیں گے اور ان گھروں کو جلا کر خاکستر کر دیں گے جہاں ایسے گمراہ لوگ رہتے ہیں یا پناہ لیتے ہیں۔ سلمان!

سلمان : جی کیپٹن۔

کیپٹن فروغی : معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا لختِ جگر کھو کر کوئی سبق نہیں سیکھا۔

سلمان میں نے آج تک کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا۔ میں ایک معلم ہوں۔ میری ساری زندگی بچوں کو تعلیم دیتے ہوئے گزری ہے۔ میں نے کبھی مسلمان اور یہودی طلباء میں کوئی فرق روا نہیں رکھا کیپٹن فروغی۔

کیپٹن فروغی، میں خوب جانتا ہوں تم جیسے معلموں کو۔ فریب دینے کی کوشش مت کرو۔ جس مجرم کو تم نے ابھی ابھی پناہ دی ہے اسے فی الفور نکال کر باہر لے آؤ۔

سلمان : کیپٹن! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے گھر میں کوئی نہیں آیا۔

کیپٹن فروغی : کوئی نہیں آیا! سچ کہہ رہے ہو؟

سلمان : بربِ کعبہ سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اپنے شاگردوں کو ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کی ہے۔ کیپٹن میں خود کس طرح.....

کیپٹن فروغی : بکو نہیں، نکالو اسے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے

سلمان : میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں کیپٹن! صبح سے اب تک آپ کے سوا یہاں کوئی نہیں آیا۔

کیپٹن فرو غی : فاطمہ یہاں نہیں آئی !

سلمان : فاطمہ کون ؟

کیپٹن فروغی : اسے اپنے گھر میں پناہ دی ہے اور معصومیت سے کہہ رہے ہو کہ فاطمہ کون ہے۔
نکالو اُسے ، ساتھ لے کر باہر آؤ ورنہ مجھے اپنی کارروائی کرنا ہو گی۔ تمہیں بیس ثانئے دیئے
جاتے ہیں۔ مجرم کو نکال کر میرے حوالے کر دو۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں سُنوں گا۔

سلمان : میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔

کیپٹن فروغی : تو گویا مجھے مجبور کر رہے ہو کہ اپنی کارروائی کروں (بلند آواز سے) نعمان اور
حاکم ! اندر آؤ۔

(دو یہودی سپاہی تیزی سے اندر آجاتے ہیں)

کیپٹن فروغی : جاؤ سارے گھر کی خوب تلاشی لو۔

سلمان : کیپٹن صاحب ! اندر کوئی نہیں میری بیوی ہے اور بچی ہے۔

کیپٹن فروغی : میں دیکھتا ہوں کون ہے اور کون نہیں ہے۔ نعمان ! جاؤ۔

(نعمان اور حاکم دروازے کے پیچھے چلے جاتے ہیں)

سلمان : آیئے میں آپ کو اندر لے چلتا ہوں۔

کیپٹن فروغی : تم یہاں سے نہیں جا سکتے رُک جاؤ۔

سلمان : آپ زیادتی کر رہے ہیں کیپٹن ! ایک امن پسند شہری کو پریشان کر رہے ہیں۔ میں نے
اپنی ساری زندگی ایک اصول پر عمل کر کے گزاری ہے اور وہ اصول ہے گوشہ نشینی۔

کیپٹن فروغی : تم اپنی گوشہ نشینی ہی سے دوسروں کو دھوکہ دیتے ہو۔

(نعمان اور حاکم عمارہ اور ذکیہ کو لے کر آتے ہیں)

نعمان : یہ دیکھئے کیپٹن۔

سلمان : یہ میری بیوی ہے اور یہ میری بچی ہے۔

نعمان : دونوں دیوار لگی ہوئی تھیں ۔ ہمیں دیکھ کر یہ لڑکی پیچھے چلی گئی مگر میں نے کمرے
میں داخل ہوتے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔

حاکم : یہی وہ مجرمہ ہے جسے ہم تلاش کر رہے تھے۔

سلمان : یہ میری بچی ذکیہ ہے میری صرف یہی ایک اولاد ہے۔ اس کے بھائی کو آپ لے گئے ہیں۔

کیپٹن فروغی : جیسا بھائی ویسی بہن ! دونوں بہن بھائی اس فتنہ گر گروہ میں شامل تھے ۔
جسے تم لوگ "الفتح" کی تنظیم کہتے ہو۔ مجھ سے غلطی ہوئی اس زمانے میں اسے بھی گرفتار کر
لینا چاہیئے تھا۔ اس نے اب تک ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔

سلمان : میری ذکیہ کیا نقصان پہنچا سکتی ہے ۔ یہ تو ایک معصوم بچی ہے ۔

کیپٹن فروغی : ذکیہ ......؟

سلمان : جی ہاں۔ اس کا نام ذکیہ ہے۔

کیپٹن فروغی : ذکیہ نہیں فاطمہ - فاطمہ ۔

حاکم : یہی فاطمہ ہے ۔

سلمان : ہرگز نہیں۔ آپ اس سے اس کا نام پوچھ لیں ۔ اس کی کتابیں دیکھ لیں ۔ ہر
جگہ اس کا نام ذکیہ بنت سلمان غنی پائیں گے ۔ ملاحظہ فرمایئے۔ اس کی یہ کتاب ۔

(سلمان ایک کرسی سے کتاب اٹھا کر کیپٹن فروغی کو دیتا ہے
کیپٹن فروغی کتاب کو دیوار پر دے مارتا ہے ۔ ہلکا سا شور)

کیپٹن فروغی : مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہو۔ لڑکی !

ذکیہ : جی

کیپٹن فروغی : تمہارا نام کیا ہے ؟ ۔

(ذکیہ خاموش رہتی ہے)

کیپٹن فروغی : خاموش کیوں ہو ! بتاؤ تمہارا نام کیا ہے !

ذکیہ : فاطمہ !

کیپٹن فروغی : فاطمہ (زور سے قہقہہ لگا کر) سُنا تم نے فریب کار معلم

سلمان : ذکیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟

کیپٹن فروغی : اُس نے اپنا صحیح نام بتایا ہے ۔تم اسرائیلی کیپٹن فروغی کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔
میں جانتا ہوں کہ دل کی سچائی کو دل کی گہرائیوں سے کس طرح کھینچ کر باہر لایا جا سکتا ہے۔
(وحشیانہ قہقہہ) کہتا ہے اس کا نام فاطمہ ہے مردود۔ پیر فرتوت۔

سلمان : میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ۔یہ ذکیہ ہے ۔یہ اس کا پیدائشی نام ہے ۔آج تک ہم اسے
اسی نام سے پکارتے رہے ہیں ۔ یہ میری بیٹی ذکیہ ہے ۔

کیپٹن فروغی : میں کہتا ہوں اب مجھے فریب مت دو۔ میں جس لڑکی کی تلاش میں اتنے دنوں
سے سرگرداں تھا۔ وہ آج میرے ہاتھ آگئی ہے۔

سلمان : کیپٹن ! مجھے خدائے موسیٰ کی قسم یہ ذکیہ ہے ۔

کیپٹن فروغی : ایک طرف ہو جاؤ۔ نعمان اور حاکم ! اس لڑکی کے دونوں ہاتھ زنجیروں سے باندھ
دو اور لے چلو ۔

(دونوں سپاہی ذکیہ کے ہاتھ زنجیروں سے باندھنے لگتے ہیں)

سلمان : ظالمو! یہ نہ کرو ۔یہ میری بچی ذکیہ ہے ۔ تم نے پہلے میرے لختِ جگر کو گرفتار کر کے شہید
کر دیا تھا اور اب میری بچی کو لیے جا رہے ہو۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ فاطمہ کوئی اور
لڑکی ہے یہ نہیں ہے میں ہر قسم کھانے کے لیے تیار ہوں ۔

کیپٹن : نعمان ! جلدی کرو۔ لے چلو فی الفور۔

سلمان : نہیں تم میری بچی کو نہیں لے جا سکتے ۔تم میری بچی کو ......

کیپٹن فروغی : اسے دھکا دے کر پرے گرا دو ۔ کیا شور مچا رہا ہے ۔

سلمان : اُف میرے خدا۔ کیپٹن فروغی ! میری بچی کو مت لے جاؤ۔

(کیپٹن اور سپاہی ذکیہ کو بیرونی دروازے کی طرف لے جاتے ہیں)

کیپٹن : (سلمان کو دھکا دے کر) جا اپنے گھر جا کر غائب ہو جاؤ ورنہ میرے غضب کی آگ تجھے بھی جلا کر خاکستر کر دے گی ؛

(سب دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں)

سلمان : (دور سے) کیپٹن فردغی ! خدارا میری بات تو سنو۔ یہ فاطمہ ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ ذکیہ ہے ! آہ ظالم۔

عمارہ : (اندرونی دروازے کے پاس جا کر)

(فاطمہ آتی ہے)

فاطمہ : کیا وہ لوگ آکر جا چکے ہیں ؟۔

عمارہ : ہاں بیٹی ! وہ آکر چلے گئے ہیں۔

فاطمہ : آپ کو تو کچھ نہیں کہا ؟

عمارہ : انہیں کہنے سے کون روک سکتا ہے۔

فاطمہ : وہ۔ آپ کی بیٹی کہاں ہے ؟

عمارہ : کہیں نہ کہیں تو ہو گی ہی۔

فاطمہ : کیا مطلب ؟

عمارہ : وہ لوگ اسے لے گئے ہیں۔

فاطمہ : کیوں ؟۔

عمارہ : اس نے کہا تھا میں فاطمہ ہوں۔

فاطمہ : اس نے کہا تھا میں فاطمہ ہوں۔ یہ کیا غضب کیا اُس نے ؟

عمارہ : اُس نے جو کچھ کہا بالکل درست کیا۔ اُس نے اپنے بھائی کی وصیت پہ عمل کیا ہے۔ جب وہ آخری بار اس گھر سے جا رہا تھا تو اس نے تمہارا حلیہ بتا کر کہا تھا کہ اگر اس حلیے اور فاطمہ نام کی

ایک لڑکی کبھی یہاں آئے اور پناہ مانگے تو اسے ہر حالت میں پناہ دینا۔ اس مقصد میں اگر جان بھی قربان کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ہچکچانا نہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میری بچی بالکل نہیں ہچکچائی۔ ذرا برابر خوف زدہ نہیں ہوئی۔ جاؤ! بیٹی جاؤ۔ اس واقعے کا کوئی خیال نہ کرو۔ میں نے اپنے بیٹے اور میری بچی نے اپنے بھائی کی آخری آرزو پوری کی ہے۔

دوسرا منظر

(الفتح کے کارکنوں کی ایک پوشیدہ قیام گاہ)

سہیل : فاطمہ!

فاطمہ : جی۔

سہیل : رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے اور تم نے ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہیں کیا۔

فاطمہ : مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔

سہیل : تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہر وقت کام۔ رات دن کام

فاطمہ : میں نرس ہوں۔ نرسنگ نہیں کروں گی تو اور کیا کروں گی؟

سہیل : فاطمہ! نہیں تمہیں اس طرح کام نہیں کرنا چاہیے۔ سارا سارا دن گھومتی پھرتی رہتی ہو اور رات کو زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی ہو۔ تمہیں آرام کا کون سا وقت ملتا ہے؟

فاطمہ : الحمد للہ! میری صحت مجھے کام کرنے کی اجازت دے رہی ہے۔

سہیل : جاؤ اب جا کر آرام کرو۔

فاطمہ : ہر دو ساعت بعد آپ کو دوا پلانی ہے۔

سہیل : میں خود پی سکتا ہوں۔

فاطمہ : آپ کو یاد ہے ڈاکٹر احمد نے آپ سے کہا تھا کہ ہلنا جلنا بالکل نہیں ہے۔ زخم جلد مندمل نہیں ہوں گے۔ لیجیے پانی پی لیجیے۔

(فاطمہ سہیل کے ہونٹوں سے پانی گلاس لگا دیتی ہے۔ سہیل پانی پیتا ہے
فاطمہ خالی گلاس ایک طرف رکھ دیتی ہے)

فاطمہ : سہیل صاحب؟

سہیل : کیوں فاطمہ؟

فاطمہ : کیا آپ مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہیں؟

سہیل : احسان کیسا! کہو میں کیا کر سکتا ہوں۔

فاطمہ : ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کل چار بجے سینما حسن الجلیل میں بہت سے یہودی فوجی افسر آئیں گے مجھے بم گرانے کی اجازت دی جائے۔

سہیل : نہیں فاطمہ! یہ کام تمہارے کرنے کا نہیں ہے۔

فاطمہ : آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ اس دن یہودی چوکی پر سب سے پہلا بم میں نے پھینکا تھا۔

سہیل : وہ بات اور تھی۔ سینما پر بم پھینکنے کے لیے بے حد احتیاط کی ضرورت ہے

فاطمہ : میں ہر قسم کی احتیاط کرنا جانتی ہوں۔

سہیل : یہ ذمّے داری یوسف کے سپرد کی جا چکی ہے۔

فاطمہ : ان کو کوئی اور ذمّے داری سونپ دی جائے۔

سہیل : تم ہماری جدوجہد میں پوری طرح شریک ہو، رات دن تگ و دو کر رہی ہو۔ تمہاری سرگرمیاں کسی مجاہد سے بھی کم نہیں ہیں۔ کیا یہ سب کچھ کافی نہیں ہے۔ جو تم ایسے کام کا تقاضا کر رہی ہو۔ جو تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔

فاطمہ : میں ان سرگرمیوں سے مطمئن نہیں ہوں۔

سہیل : مطمئن کیوں نہیں ہوا؟

فاطمہ : یہ بہت معمولی کام ہیں۔

سہیل : میں جانتا ہوں کہ یہ تمہاری بلند ہمتی ہے کہ ایسی اہم سرگرمیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں میں

مجبور ہوں۔ یہ فرض یوسف ہی ادا کرے گا۔

فاطمہ: مجھے مایوس نہ کیجئے۔ سہیل صاحب! خدا کے لیے مایوس نہ کیجئے۔

سہیل: جو فریضہ تم اپنے ذمے لینا چاہتی ہو، اُس کا تمہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہودی فوجی افسروں کے ساتھ بے شمار فوجی لوگ ہوں گے اور نہ جانے کتنے جاسوس ہوں گے۔ ایسے موقعے پر کیسی کیسی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ یہ تم اچھی طرح جان سکتی ہو۔ اور پھر یہ بھی دیکھو میرے تکیے کے نیچے یاسر عرفات کا رقعہ موجود ہے۔ سیدی یاسر عرفات نے تاکیداً کہا ہے کہ جو شخص جس ذمے داری کے لائق ہو، وہی اس کو سونپی جائے۔

فاطمہ: مگر انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ بم گرانے کا کام عورت کے سپرد نہ کیا جائے۔

سہیل: ہاں انہوں نے واضح طور پر یہ نہیں کہا۔ لیکن انہوں نے جو کہہ دیا ہے کہ ذمے داری آدمی کی صلاحیت کا جائزہ لے کر سپرد کی جائے۔ مگر فاطمہ! تم میرے ایک سوال کا جواب دو، تم یہ انتہائی خطرناک ذمے داری کیوں لینے پر مُصر ہو؟

فاطمہ: آج صبح جب میں سیدی یاسر عرفات کی نئی ہدایت جبران کو پہنچا کر واپس آ رہی تھی تو کیپٹن فرزعی کے کسی سپاہی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ ان سب نے میرا تعاقب کرنا چاہا تو میں ایک مکان میں چلی گئی۔

سہیل: یہ واقعہ تم مجھے بتا چکی ہو کہ ایک مدرس کی لڑکی نے خود کو فاطمہ کہہ کر تمہیں گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا۔

فاطمہ: اس وقت مجھے اس لڑکی کی عظیم قربانی کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہوا تھا کہ میرا حقیر وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ سہیل صاحب! اب اگر میں کوئی عظیم کارنامہ انجام نہ دوں تو میرے وجود کی اہمیت کیا باقی رہتی ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے اس کی اجازت دے دیں۔ آپ سوچنے کیوں لگے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں میں اس میں ناکام ہوں گی۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں ہر خطرے میں کود سکتی ہوں۔ مجھے کوئی خطرہ بھی خوفزدہ نہیں

کر سکتا۔

سہیل : تم جو کچھ کہہ رہی ہو درست ہے

فاطمہ : پھر کہہ دیجئے کہ یہ مہم تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔

سہیل : فاطمہ ! میں یہ کر سکتا ہوں کہ صبح اپنی تنظیم کے چند دوسرے رہنماؤں سے رابطہ قائم کرکے انہیں تمہاری آرزو سے مطلع کر دوں۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو پھر تمہیں کوئی نہیں روک سکے گا۔

فاطمہ : میں آپ کی شکر گزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔

سٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا

موسیقی جو چند سیکنڈ کے بعد ایک دم بلند ہو جاتی ہے۔ جب یہ موسیقی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے تو سینما ہاؤس پر بم کے گرنے سے ایک زور دار اور خوفناک دھماکا ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سینما کی چھت اور دیواروں کے انہدام سے قیامت خیز شور برپا ہوتا ہے۔ یہودی افسروں اور سپاہیوں کی چیخوں سے اس شور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہنگامہ کم از کم تیس سیکنڈ جاری رہتا ہے۔ پھر یہ شور آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگتا ہے اور اس کی جگہ ہلکی موسیقی لے لیتی ہے۔

(جب سٹیج پر دوبارہ روشنی آتی ہے تو ہم یہودی
کرنل جواد اور سپاہی حاکم کو دیکھتے ہیں)

یہودی کرنل جواد : (گرجتی ہوئی آواز میں) حاکم !

حاکم : جی حضور !

کرنل : کیپٹن فروغی کو بلاؤ۔

(حاکم باہر نکل جاتا ہے اور جب واپس آتا ہے
تو اس کے ساتھ کیپٹن فروغی بھی ہے)

کیپٹن : جی کرنل ۔

کرنل : کیپٹن فروغی !

کیپٹن : ارشاد جناب ۔

کرنل : تم کل سے شور مچا رہے ہو کہ تم نے الفتح کی خطرناک کارکن خاتون فاطمہ کو گرفتار کر لیا ہے ۔

کیپٹن : میں نے کئی روز کی مسلسل تگ و دو کے بعد اُسے گرفتار کر لیا ہے ۔

کرنل : غلط کہہ رہے ہو کیپٹن فروغی تم فاطمہ کو گرفتار نہیں کر سکے ۔ تمہیں فریب دیا گیا تھا ۔ یہ فاطمہ وہ لڑکی نہیں ہے جسے تم زنجیروں میں باندھ کر لے آئے تھے ۔ فاطمہ وہ لڑکی ہے جس نے آج شام سینما ہاؤس پر بم گرایا ہے ۔

کیپٹن : میں نے اُس کے مکان کی تلاشی لے کر اسے برآمد کیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں فاطمہ ہوں ۔

کرنل : دھوکہ کھا گئے ہو تم ۔ اس وقت مدرس سلمان غنی کے مکان میں فاطمہ ضرور چھپی ہو گی اور اسے بچانے کے لیے مدرس کی اپنی لڑکی نے تمہیں یقین دلایا ہو گا کہ وہ فاطمہ ہے ۔ کیپٹن فروغی ! تم ابھی تک سمجھ نہیں سکے کہ یہ الفتح کی تنظیم یہودی حکومت کے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہو چکی ہے اور اس کے کارکن کتنے دلیر اور بہادر ہیں ۔ جان قربان کر دینا تو اُن کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہے ۔ میں پوچھتا ہوں تم نے مدرس کی لڑکی پر کیوں اعتبار کر لیا تھا ۔ پورے مکان کی تلاشی کیوں نہیں لی تھی ؟ ۔

کیپٹن : مجھے افسوس اور ندامت ہے کہ میں دھوکا کھا گیا ۔ مگر میں اس حالت میں وہی کچھ کر سکتا تھا جو میں نے کیا ۔

کرنل : تم وہی کچھ کر سکتے تھے ؟ کیوں وہی کچھ کر سکتے تھے ؟ ۔

کیپٹن : میں نے یا میرے سپاہیوں نے فاطمہ کی کبھی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی ! اگر ہم نے فاطمہ کی صورت ایک بار بھی کہیں دیکھ لی ہوتی تو اس فریب میں کبھی نہ آتے ۔

کرنل : تم نے مدرس کی لڑکی کی باتوں سے اندازہ نہ لگایا کہ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے ؟ ۔

کیپٹن : اُس کے لہجے سے صاف طور پر معلوم ہوتا تھا کہ سچ کہہ رہی ہے۔

کرنل : اور تم یہ بھی تو کہتے ہو کہ مدرس نے کہا تھا کہ یہ میری بیٹی ذکیہ ہے۔ فاطمہ نہیں ہے ؟۔

کیپٹن : کہا تھا۔

کرنل : اس کے باوجود تمہارے دل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ گزرا۔ تم یہی سمجھتے رہے کہ فاطمہ یہی لڑکی ہے۔ کیپٹن فروغی ! تم زیرک اور عقلمند فوجی افسر سمجھے جاتے ہو۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ الفتح کے کارکن تم سے زیادہ عقل مند اور زیرک ہیں۔

کیپٹن : مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ عرب حکومتوں کو ہم شکست پر شکست دے سکتے ہیں لیکن الفتح کو ختم کرنا شاید اتنا آسان نہیں ہے۔

کرنل : بلکہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے جبکہ ایک معمولی مدرس کی ایک عام سی لڑکی بھی ہمارے سب سے ہوشیار کیپٹن کو دھوکا دے سکتی ہے۔ کیپٹن فروغی !

کیپٹن : جی کرنل۔

کرنل : تمہیں اندازہ ہے کہ فاطمہ نے سینما ہاؤس پر بم گرا کر ہمارا کتنا نقصان کیا ہے ؟ ۔

کیپٹن : مجھے اندازہ ہے۔

کرنل : پچھلے ایک سال میں مختلف مقامات پر جو مسلمان فوجیوں سے تصادم ہوتے رہے ہیں۔ ان میں ہمارے اتنے افسر اور سپاہی نہیں مارے گئے جتنے اس حادثے میں ختم ہو گئے ہیں۔ تمہیں خبر ہے اسی سینما ہاؤس کے تہہ خانے میں ہمارا بہت سا اسلحہ بھی جمع تھا۔ جو سب کا سب برباد ہو گیا ہے۔ اور یہ سارا نقصان صرف ایک لڑکی نے پہنچایا ہے۔

کیپٹن : میں شرمندہ ہوں کرنل !

کرنل : صرف شرمندگی سے کچھ نہیں ہوگا۔

کیپٹن : مجھے حکم دیجئے۔

کرنل : حاکم ! اس لڑکی کو لاؤ۔

ذرا سا وقفہ۔ پھر زنجیر کی جھنکار جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہودی سپاہی ذکیہ کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے لا رہے ہیں
حاکم ذکیہ کو لاتا ہے

کرنل: لڑکی! سچ سچ بتاؤ۔ تم کون ہو؟۔

ذکیہ: میں کہہ چکی ہوں۔ ایک بار نہیں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں۔

کرنل: تم فاطمہ ہو؟۔

ذکیہ: ہاں! میں فاطمہ ہوں۔

کرنل: غلط کہہ رہی ہو۔ تم فاطمہ نہیں ہو۔ ذکیہ ہو۔

ذکیہ: میں فاطمہ ہوں۔

کرنل: (ذرا نرمی سے) لڑکی! مجھے ایک بات کا جواب دو۔ میں جانتا ہوں تم فاطمہ نہیں ہو اور تم بھی جانتی ہو کہ تم فاطمہ نہیں ہو۔ پھر تم خود کو فاطمہ ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟۔

ذکیہ: وہ اس لئے کرنل۔ آج فلسطین اور فلسطین کے باہر ہر عرب گھرانے کی ہر لڑکی فاطمہ بن چکی ہے۔ فاطمہ صرف ایک لڑکی کا نام نہیں۔ ان ہزاروں اور لاکھوں لڑکیوں کا نام ہے جو فلسطین کی آزادی کی خاطر ہتھیار لے کر میدان میں آگئی ہیں فاطمہ اس فلسطینی روح کا نام ہے جو ہر عرب لڑکی کے سینے میں شعلہ ریز ہے۔

کرنل: لڑکی! تمہیں خبر ہے اگر تمہیں فاطمہ سمجھ لیا جائے تو کتنی خوفناک سزا تمہیں دی جا سکتی ہے؟۔

ذکیہ: صرف ایک فاطمہ یہودی ظلم و ستم کا نشانہ بنے گی اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

کرنل: کیا تمہاری جان، تمہاری اپنی جان نہیں ہے؟

ذکیہ: میری اپنی جان ہے اس لیے مجھے اس پر پورا پورا اختیار ہے کہ جب چاہوں اسے آزادی کی جنگ میں قربان کر دوں۔

کرنل: حاکم!

حاکم: جی حضور!

کرنل: اسے وہیں لے جاؤ جہاں سے لائے تھے۔

(حاکم ذکیہ کو لے جاتا ہے)

کیپٹن: جی کرنل!

کرنل: تم نے اس لڑکی کا طور طریقہ دیکھا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ فلسطین کی آزادی کا جذبہ کیسے جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ میدان جنگ میں فوجوں کا تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر اس آگ کا مقابلہ کیونکر ہو گا۔ (گرج کر) کیپٹن!

کیپٹن: جی جناب۔

کرنل: تمہیں تین دن کی مہلت دی جاتی ہے جس طرح بھی ممکن ہو فاطمہ کو گرفتار کر کے لاؤ ورنہ ایک ایسا داغ ہمارے چہروں پر لگ جائے گا جو کبھی نہیں دھل سکے گا۔

کیپٹن: میں ہر طرح کوشش کروں گا کرنل۔

(سلمان غنی کا گھر)

دروازے پر دستک ہوتی ہے عمارہ جاتی ہے

اور جب واپس آتی ہے تو اس کے ساتھ فاطمہ بھی ہے

عمارہ: بیٹی تم کیوں آئیں۔ فوراً چلی جاؤ۔

فاطمہ: میں جانے کے لیے نہیں آئی۔

سلمان: تم نہیں جانتیں بیٹی کہ......

فاطمہ: میں جانتی ہوں۔ یہودی کیپٹن نے شہر کی دیواروں پر لکھوا دیا ہے کہ اگر آج شام تک فاطمہ نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہ کیا تو ذکیہ کو پھانسی دے دی جائے گی۔

سلمان: تم جانتی ہو پھر بھی آ گئی ہو۔

فاطمہ: میں جانتی ہوں اسی لیے تو آ گئی ہوں۔

سلمان: نہیں فاطمہ! تمہیں گرفتار نہیں ہونا چاہیئے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک عظیم کارنامہ ہے تم نے میرے خیالات بدل دیئے ہیں۔ مجھے اندھیروں سے روشنی میں لے آئی ہو۔ عزیز بیٹی! فلسطین کی جہد آزادی کے لیے تمہارا وجود بے حد اہم ہے اور مجھے فخر ہے کہ میرا لخت جگر شہید ہوا ہے اور بیٹی نے فاطمہ کے لیے اپنی زندگی موت کے حوالے کر دی ہے فاطمہ! فی الفور چلی جاؤ۔

فاطمہ: میں آپ کے جذبے کی دل وجان سے قدر کرتی ہوں۔ لیکن اپنے بجائے ایک معصوم ہستی کو پھانسی کے تختے پر نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس ارادے کے ساتھ یہاں آئی ہوئی کہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دوں گی اور اس بات کی اطلاع بھی یہودی کیپٹن کو مل چکی ہے۔

سلمان: فاطمہ! تمہیں یہ ارادہ بدل دینا ہوگا۔ دیکھو ہزاروں لڑکیاں بھی مرجائیں تو کوئی بات نہیں ہے۔ مگر ایک فاطمہ کو نہیں مرنا چاہیئے۔ بیٹی! تم نے آزادیٔ وطن کا چراغ روشن کیا ہے۔ یہ چراغ جلتے رہنا چاہیئے۔

فاطمہ: یہ چراغ ہمیشہ روشن رہے گا۔ یہودی ظلم وستم کے ہزاروں جھونکے چلیں پھر بھی اس چراغ کی روشنی دُور دُور تک بکھرتی رہے گی۔ اس کی لَو میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

(دروازے پر زور زور سے ٹکر مارے جاتے ہیں)

سلمان اور عمارہ (بیک وقت) فاطمہ۔

فاطمہ: دروازہ کھول دیجئے۔ میں خود کھولتی ہوں۔

(فاطمہ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ کیپٹن فروغی آتا ہے)

کیپٹن فروغی: تو تم آگئیں۔؟

سلمان: یہودی کتے تم میری زندگی میں فاطمہ کو گرفتار نہیں کر سکتے۔

کیپٹن فروغی: پیچھے ہو جاؤ ورنہ میری سنگین تمہارے سینے سے پار ہو جائے گی۔

فاطمہ: عم محترم! آپ بالکل خاموش رہیں۔ دیکھیے یہ میری آرزو ہے۔ میری آرزو کا خیال کیجیے۔
اسے پامال نہ کیجیے۔ کیپٹن لے چلو مجھے۔

کیپٹن فروغی: زنجیروں سے باندھ لو اِسے۔

(فاطمہ کو زنجیروں سے جکڑ کر لے جایا جا رہا ہے
سٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جب روشنی آتی ہے تو سامنے
کرنل جواد اور کیپٹن فروغی کے ساتھ فاطمہ بھی کھڑی ہے)

کرنل: (بلند اور وحشیانہ قہقہہ لگا کر) تو یہ ہے اصلی فاطمہ!

کیپٹن فروغی: مَیں نے وعدہ کیا تھا کہ اُسے جلد گرفتار کر کے لے آؤں گا۔

کرنل: (آواز نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی) تم بہت اچھے سپاہی ہو۔ بہت اچھے۔

(شراب کا پیگ زور سے فرش پر پھینکتا ہے۔)

کیپٹن فروغی: کیپٹن فروغی ناکام نہیں ہو سکتا۔

کرنل: نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ درست کہتے ہو۔ نہیں ہو سکتا۔ اے کوئی ہے۔ تیز
شراب لاؤ۔ اے لڑکی! تو نے بہت شور مچا رکھا تھا۔ بہت فسادی ہو۔ آج یہ شور مچانے والا گلا
بند کر دیا جائے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے گا۔ (پُر زور قہقہہ) یہودی عظمت
کا مقابلہ کرتی ہو حقیر ہستی!

فاطمہ: میں نے خود کو گرفتار کرا دیا ہے۔ اب ذکیہ کو آزاد ہو جانا چاہیے۔

کرنل: ضرور ضرور آزاد ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے الفاظ کا پورا پورا پاس ہے۔ ہم صرف ذکیہ ہی
کو نہیں تمہیں بھی آزاد کر دینا چاہتے ہیں کیپٹن

کیپٹن فروغی: جناب!

کرنل: ایک گن لاؤ اور اس لڑکی کے ہاتھ میں دے دو۔

(کیپٹن فروغی ذکیہ کو گن دیتا ہے)

ذکیہ : کیا ہے کرنل!

کرنل : تم نشانہ باندھو اور گولی فاطمہ کے سینے سے گزار دو۔ پھر تم آزاد ہو جاؤ گی۔ ہماری قید سے اور فاطمہ آزاد ہو جائے گی قیدِ حیات سے! کیپ ٹن! کیسی ہے یہ سکیم، نقلی فاطمہ اصلی فاطمہ کو ہلاک کر رہی ہے۔ (وحشیانہ قہقہہ) دونوں آزاد ہو رہی ہیں۔

کیپٹن فرعونی : لاجواب سکیم ہے جناب!

کرنل : اے لڑکی! تین پر تجھے گولی چلانی ہے۔ ایک، دو......

(ذکیہ گن پھینک دیتی ہے)

کیپٹن فرعونی : اس نے گن پھینک دی ہے۔

کرنل : اس لڑکی کی یہ جرأت؟

(کرنل زور سے ذکیہ کے گال پر تھپڑ مارتا ہے)

ذکیہ : میں یہ ذلیل حرکت ہرگز نہیں کروں گی!

کرنل : تجھے کرنا ہوگی! ورنہ تو آزاد نہیں ہو گی!

ذکیہ : مجھے ایسی آزادی کی ضرورت نہیں ہے۔

فاطمہ : کرنل! کیا تمہارے اور تمہارے کیپٹن کے ہاتھ شل ہو گئے ہیں جو اسے گولی چلانے کے لیے کہہ رہے ہو۔ تم جو سلوک چاہو میرے ساتھ کر سکتے ہو جو ظلم چاہو روا رکھ سکتے ہو مگر میری گرفتاری کے بعد اس کی گرفتاری کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

کرنل : گرفتاری کا جواز باقی رہتا ہے یا نہیں رہتا اس کا فیصلہ ہمیں کرنا ہے تو کون ہوتی ہے دخل دینے والی! کیپ ٹن!

کیپٹن فرعونی : حضور!

کرنل : دوبارہ گن اس کے ہاتھ میں دو۔ اگر تین کی گنتی تک اس نے گولی نہ چلائی تو پھر دونوں کو مشین گن سے پرزے پرزے کر دیا جائے گا۔ ایک۔ دو۔

(ذکیہ پھر گن پھینک دیتی ہے)

پھر پھینک دی ہے اس نے گن - کیپ ٹان!

کیپٹن فرد غی: جی حضور!

کرنل: دونوں کو سامنے لے آؤ - ہم خود ان کا جسم چھلنی چھلنی کریں گے! بولو ذکیہ اس پر گولی چلاؤ گی؟ -

ذکیہ: نہیں - نہیں اور نہیں -

کرنل: تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے - پاگل ہو گئی ہو - ہم تمہیں رہا کرنا چاہتے ہیں اور تم مرنا چاہتی ہو -

ذکیہ: مجھے ایسی ذلت آمیز رہائی منظور نہیں ہے -

کیپٹن فرد غی: کرنل! حکم دیجئے - میں ایک لمحے میں دونوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں -

کرنل: یہ آسان موت ہے اور ہم انہیں آسانی کے ساتھ مرتے نہیں دیکھنا چاہتے - ہم شدید ترین سزا دینا چاہتے ہیں -

کیپٹن فردغی: بجا ارشاد!

کرنل: نعمان!

نعمان: جی جناب!

کرنل: سلاخیں گرم کر کے لاؤ - اور تم ذکیہ! یہاں آؤ - اس کرسی کے اوپر - کیپ ٹن! اسے کھینچ کر ادھر لاؤ -

(نعمان چلا جاتا ہے)

اس کرسی کے اوپر - یوں - اب جو کچھ تمہارے سامنے ہوگا اسے پوری طرح اپنی آنکھیں کھول کر دیکھو - جو کچھ سنو - اسے مکمل طور پر اپنے کانوں میں محفوظ کر لو - اپنی زبان بند رکھو - ایک لفظ بھی نہ نکالو - بس دیکھو اور سنو - سنو اور دیکھو اور جب تمہیں یہاں سے

باہر نکالا جائے تو آزاد فلسطین کا بے معنی اور بے ہودہ نعرہ لگانے والے پاگل اور جنونی لوگوں کو وہ سب کچھ بتاؤ۔ جو تم عنقریب دیکھو گی۔ اور ان کربناک چیخوں کا سارا حال سناؤ۔ جو چند لمحوں کے بعد تمہارے کان سنیں گے۔ ان نادانوں اور احمقوں کو بتاؤ کہ اسرائیلی حکومت باغیوں اور نافرمانوں کو شدید سزا دینے پر بھی قادر رہے۔

فاطمہ : اور شدید سے شدید ظلم کر سکتی ہے۔

کرنل : یقیناً۔

فاطمہ : مگر کرنل ان لوگوں کی طرف سے جنہیں تو اپنے ظلم و ستم سے خوفزدہ کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ اعلان کرتی ہوں کہ اگر تم ظلم کرنے جانتے ہو تو وہ ظلم سہنا ہی نہیں ظلم کا مقابلہ کرنا بھی جانتے ہیں۔

کرنل : مقابلہ ! (وحشیانہ قہقہہ) تمہاری تمام حکومتیں بھی مل کر ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتیں !

فاطمہ : انہوں نے ابھی مل کر مقابلہ نہیں کیا۔ مگر اصل مقابلہ ہمارے عوام کریں گے۔ ہمارے عوام جو غریب ہیں، بے ہتھیار ہیں اور مظلوم و مقہور ہیں۔ یہی عوام ایک سیلاب بن کر تمہاری ساری مانگے تانگے کی طاقت اور اس طاقت کا سارا غرور تنکوں کی طرح بہا کر لے جائیں گے، عوام کی اس طاقت کا نام الفتح ہے۔

کرنل : الفتح ! خاموش۔ یہ لفظ کہو گی تو میں تمہاری زبان گدی سے باہر نکال دوں گا !

(نعمان گرم سلاخیں لے کر آتا ہے)

فاطمہ : یہ لفظ تمہاری روح کا ناسور ہے۔ تمہارے ذہن کا بھیانک خواب ہے، تمہارے ہوش و حواس کے لیے برقِ خاطف ہے۔

کرنل : خاموش ! کیپٹن ! وہ سلاخیں نہیں لایا !

کیپٹن فروغی : لے آیا ہے۔

کرنل : نعمان ! ان تپتی ہوئی سلاخوں سے اس کا تمام جسم زخموں سے بھر دو !

نعمان : جیسا ارشاد!

کرنل : تم کیا کر رہے ہو نعمان ؟ لگاتے کیوں نہیں سلاخیں اس کے بدن سے۔

نعمان : لگاتا ہوں جناب!

(نعمان گرم سلاخیں فاطمہ کے جسم سے لگاتا ہے)

کرنل : تو یہ چیختی کیوں نہیں ؟

فاطمہ : خبیث یہودی! مجھ سے پوچھ کہ میں چیختی کیوں نہیں! تمہارا کوئی ظلم بھی روحِ فلسطین کو ہراساں نہیں کر سکتا!

کرنل : روحِ فلسطین — تم روحِ فلسطین ہو!

فاطمہ : رُوحِ فلسطین ہر فلسطینی مسلمان میں ہے! یہ روح تابندہ ہے۔ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

کرنل : میں اس رُوح کو کچل دوں گا۔

فاطمہ : تم ایک صدی سے نہیں کئی صدیوں سے اس روحِ جلیل پر حملے کر رہے ہو۔ لیکن آج تک شکست پر کھاتے رہے ہو۔ آج تم اپنی تمام پچھلی شکستوں کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ مگر یاد رکھو کہ ایک ایسی عبرتناک شکست کھاؤ گے کہ جیتی جاگتی "دیوارِ گریہ" بن جاؤ گے۔

کرنل : (جھنجھلا کر) کیپٹن! اِسے سارے کمرے میں گھسیٹو۔ یہاں تک کہ اس کی جان کھنچ کر اس کے لبوں تک آجائے۔

مر گئی ہے کیا!

نعمان : لگتا ہے مر گئی ہے۔

کرنل : مگر اس کے لب کیوں حرکت کر رہے ہیں ؟

نعمان : کچھ کہہ رہی ہے۔

کرنل : کیا کہہ رہی ہے۔

(فاطمہ کی مدہم آواز "آزاد فلسطین زندہ باد" کہتی ہوئی ابھرتی ہے۔
یہ آواز دو تین لمحے مدھم اور کمزور سی رہتی ہے۔ اس کے بعد بتدریج
بلند ہونے لگتی ہے اور بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے)

کرنل : (سخت جھنجھلاہٹ کے عالم میں) اسے لے جاؤ۔ اسے قید خانے میں بند کردو۔ فی الفور!
لے جاؤ۔ اس کی آواز شعلے بن کر ہمارے دل میں اتر رہی ہے۔ اُف خدا کی پناہ لے
جاؤ۔ جلدی کرو۔ لے جاؤ۔ اسے لے جاؤ۔

کالا آدمی

کردار

پہلا سفید فام افسر
دوسرا سفید فام افسر
سیکرٹری
پست قد سیاہ فام
چند سفید فام سپاہی
اور
کالا آدمی

پہلا منظر

یہ واقعہ براعظم افریقہ کے ایک خاص حصے میں رُو پذیر ہوتا ہے
— جہاں آجکل یورپ کی استعماری قوتیں ہنگامہ دار و گیر برپا کئے ہوئے ہیں۔
اس حصے میں یورپ کے ایک ملک کا صدر دفتر — ایک ایسے ملک
کا صدر دفتر جس کی موجودہ تاریخ افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کے خون
سُرخ سے لکھی جائے گی — صدر دفتر کا ایک وسیع، شاندار اور سجا
سجایا کمرہ۔

کمرے کی جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ سامنے انگیٹھی پر یسوع مسیح
کا ایک خاصا بڑا مجسمہ ہے۔ اس مجسمے میں یسوع مسیح کو صلیب پر
لٹکتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

دو دروازے۔ ایک دائیں جانب جس میں دفتر کے متعلق لوگ
آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک دروازہ سامنے بھی ہے مگر اس کے
دونوں پٹ بند ہیں۔ غالباً یہ دروازہ باہر کے لوگوں کے لئے ہے۔

دائیں دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک بڑی میز۔ اوپر کاغذات،
کتابیں، شراب کی بوتلیں۔ بیگ۔ نقشے۔ ایک بڑا سا گلوب اور اسی

قسم کی دوسری اشیاء۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے — اور پردہ دوپہر کے وقت اٹھتا ہے)

ایک سفید فام فوجی افسر میز پر جھکا ہوا کسی نقشے کو دیکھ رہا ہے، منہ میں پائپ جسے وہ گفتگو کرتے وقت عموماً دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے

افسر کاغذ پر جھکا ہوا ہے کہ دور سے ایک بھرپور اور پرجوش آواز آتی ہے۔ جاگ اٹھا ہمارا افریقہ!

افسر اس انداز میں میز سے الگ ہو جاتا ہے جیسے جھنجلا گیا ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی بھنچ جاتی ہے اور وہ انگیٹھی کی طرف جانے لگتا ہے — آواز بلند ہو گئی ہے۔

لو وہ نکلا ہے مہر آزادی

لو وہ ٹوٹیں تمام زنجیریں

جاگ اٹھا ہمارا افریقہ

اس وقت اس کی پشت ہمارے سامنے ہے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں۔ وہ انگیٹھی کے پاس جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ آواز بلند ہو گئی ہے —

لو وہ جاگے غلام صدیوں کے

لو وہ بھاگے سفید فام آقا

بہت سی آوازیں گونجتی ہیں ایک ساتھ —

جاگ اٹھا ہمارا افریقہ

افسر کا ہاتھ کمر پر جا کر پستول کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے غصے میں زور سے زمین پر پاؤں مارتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجسمے کو دیکھتا

ہے اور مڑ کر تیزی کے ساتھ میز کی طرف آنے لگتا ہے۔ آواز اور بلند ہوتی ہے۔

روک سکتا ہے کون طوفان کو

کون ٹکرائے گا پہاڑوں سے

پہلے کی طرح بہت سی آوازیں ایک ساتھ گونجتی ہیں۔ وہ انگیٹھی کی طرف جانے لگتا ہے — آواز آتی ہے

جاگ اٹھا ہمارا افریقہ

وہ دوسری مرتبہ انگیٹھی سے لوٹ کر آتا ہے تو آوازیں دور ہو گئی ہیں دائیں دروازے سے دوسرا افسر آتا ہے۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی جسے وہ گفتگو کے دوران بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر آہستہ آہستہ ملتا رہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ دوسرا افسر آگے بڑھتا ہے —

پہلا افسر: (ہاتھ ابھی تک پستول پر ہے) دیکھا تم نے۔ یہ تماشا ابھی تک ہو رہا ہے!

دوسرا افسر: اور ہوتا رہے گا!

(دوسرا افسر آگے بڑھتا ہے۔ میز پر ایک پھیلتی ہوئی نظر ڈالتا ہے اور پھر مسکرا کر اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے۔)

پہلا افسر: (پستول پر گرفت مضبوط) ہرگز نہیں۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔

دوسرا افسر: میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ یہ آواز ہمیشہ کے لیے رک جائے — مگر —

(ایک بوتل کھول کر پیگ میں تھوڑی سی شراب ڈالتا ہے اور اسے ایک ہی گھونٹ میں پی جاتا ہے۔)

پہلا افسر: (دوسرے افسر کو گھورتے ہوئے) مگر —

(دوسرا افسر کوئی جواب نہیں دیتا۔ پہلا افسر زور سے "مگر" دوبارہ کہتا ہے۔)

دوسرا افسر: (خالی پیگ میز پر رکھتے ہوئے) یہ آواز جو تم ہر روز سنتے ہو۔ "صرف کالے آدمی"
کی آواز نہیں ہے۔ لاکھوں آوازیں اس آواز میں گونج رہی ہیں۔

(دوسرا افسر چھڑی بائیں ہتھیلی پہ مارتا ہے)

شاید تمہیں خبر نہیں مگر طوفان آچکا ہے۔

پہلا افسر: یہ طوفان —؟ (پہلا افسر یوں سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھ لوں گا اس طوفان کو)

دوسرا افسر: ہم نے بہت غلطی کی جو اس آواز کو طوفان بننے کا موقع دیا۔ بہت پہلے اس کالے
آدمی کا گلا کاٹ دینا چاہیئے تھا۔

(اثبات میں سر ہلاتے ہوئے) اب کیا ہوگا؟

اگر اسے آج ہی ختم نہ کیا گیا تو یہ آواز سارے افریقہ میں طوفان برپا کر دے گی ——
ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک۔

(دوسرا افسر دائیں ہاتھ سے گلوب گھما دیتا ہے اور اس کی طرف چھڑی سے
اشارہ کرتا ہے۔)

یہی کچھ ہونے والا ہے۔ یہ دنیا زیر و زبر ہو جائے گی — یہ کالا آدمی جو یہاں بازاروں
اور گلیوں میں چیختا پھرتا ہے سارے یورپ کا سب سے بڑا دشمن ہے، سب سے خطرناک
دشمن ہے۔

(پہلا افسر پیٹی میں سے پستول نکال چکا ہے۔ دوسرے افسر کی نظر پستول
پر پڑتی ہے)

لیکن یوں نہیں ہوگا۔ پستول استعمال کرنے سے پہلے ہمیں (چھڑی آہستہ آہستہ
اپنے سر پہ مارتا ہے) اس سے کام لینا ہوگا — بہت احتیاط کی ضرورت
ہے۔ ورنہ کیے کرائے پہ پانی پھر جائے گا۔

پہلا افسر: دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہمارے ساتھ ہے اس کے ساتھ کون ہے؟

دوسرا افسر: (ہنس کر) تم نہیں جانتے؟

(دونوں ایک دوسرے کو گھور کر دیکھتے ہیں)

صرف افریقہ ہی بہت کافی ہے۔ افریقہ اُسے اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے —
نجات دہندہ — یسوع مسیح۔

(دوسرا افسر مجسمے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

پہلا افسر:۔ نجات دہندہ! یسوع مسیح —

(پہلا افسر مجسمے کی طرف دیکھتا ہے۔)

دوسرا افسر: بہت سوچ بچار سے قدم اٹھانا ہوگا۔ بظاہر ہم اس ملک کو آزادی دے چکے ہیں اور لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اب ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے!

(پہلا افسر کی نگاہ ابھی تک مجسمے پر ہے)

پہلا افسر: (مجسمے سے نگاہ ہٹاکر اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے) تم نے کیا سوچا ہے؟

دوسرا افسر: ہماری انگلیاں پستول کی لبلبی پر ہونی چاہئیں — مگر پستول ہمارے ہاتھ میں نہیں —

(پہلا افسر اثبات میں سر ہلاتا ہے، جیسے تائید کر رہا ہو)

دنیا کو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ایک کالے آدمی نے دوسرے کالے آدمی کو مار دیا ہے۔
یہی ہونا چاہیئے!

پہلا افسر:۔ اس کا سب سے بڑا دشمن تو ہمارے ہاتھ میں ہے!

دوسرا افسر: میں جانتا ہوں وہ اس کے خون کا پیاسا ہے — لیکن بات یہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔

پہلا افسر:۔ تو پھر؟

دوسرا افسر:۔ ان دونوں کے درمیان لاکھوں انسانوں کا سمندر بہہ رہا ہے۔ یہ شخص اسے

مار ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی ہر دل عزیزی سے ہراساں ہے۔

پہلا افسر: میں اسے مار ڈالوں گا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ افریقہ میں ہمارا وقار ختم ہو جائے۔ دیکھوں گا اب کس طرح چیختا ہے ــــ میں اپنے پستول کی ساری گولیاں اس کے سینے میں بھر دوں گا۔ اسے صلیب پر لٹکا دوں گا۔

(دوسرا افسر پہلے افسر کے دائیں شانے پر چھڑی رکھ دیتا ہے)

دوسرا افسر: تم غلطی کرو گے ــــ اس سے تمہارے حصے میں صرف ناکامی کی رسوائی آئے گی ــــ اور کچھ نہیں ــــ اس طرح تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

(پہلا افسر غضب ناک نظروں سے دیکھتا ہے)

تم یہی چاہتے ہو نا کہ یہ آواز ختم ہو جائے؟

پہلا افسر: سب یہی چاہتے ہیں۔

دوسرا افسر: میں نے ایک سکیم سوچ لی ہے۔

پہلا افسر: کون سی سکیم؟

دوسرا افسر: (چھڑی اپنے ہاتھ کی پشت پر مارتے ہوئے) سب کچھ ہو جائے گا اور ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔

(پہلا افسر استفسار طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے)

مجھ پر اعتماد کرو۔

پہلا افسر: یہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ سکیم ہے کیا؟

دوسرا افسر: ابھی معلوم ہو جائے گی تمہیں!

(دوسرا افسر میز کے پاس جا کر گھنٹی بجاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد دروازے پر سیکرٹری آتا ہے۔ سیکرٹری بھی سفید فام ہے جو دروازے پر آکر مودبانہ سر جھکاتا ہے۔ اور اس سے پیشتر کہ آگے بڑھے دوسرا افسر چھڑی سے ایسا اشارہ کرتا ہے

"اسے بھیج دو" ـــ سیکرٹری ادب سے سر جھکاتا ہے اور دروازے میں سے
نکل جاتا ہے۔

دو تین لمحوں کے لیے خاموشی رہتی ہے۔

دروازے پر ایک پست قامت سیاہ فام آدمی آتا ہے ۔چہرہ خاصا بڑا اور
بھیانک ۔سفید کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے ۔ سر پر سفید ہیٹ ـــ یہ سیاہ فام
آدمی ایک لمحے کے لیے رکتا ہے ۔تسلیم کے طور پر سر جھکاتا ہے مسکراتا ہے اور
آگے بڑھتا ہے۔

جواب میں دونوں سفید فام بھی مسکرا کر ذرا سا خم گردن کو دیتے ہیں۔

دوسرا افسر آگے بڑھتا ہے اور اس سے مصافحہ کرتا ہے۔

پہلا افسر بھی آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتا ہے اور پھر اس کے
شانے کو تھپتھپاتا ہے۔

تینوں میز کے قریب آجاتے ہیں

دوسرا افسر پیگ اس کی طرف بڑھاتا ہے ۔سیاہ فام بڑے بڑے دانت
نکال کر شکریے کے انداز میں سر کو خم دیتا ہے اور پیگ لے لیتا ہے جلدی
سے اسے خالی کر کے میز پر رکھ دیتا ہے۔)

پہلا افسر : تو کیا سوچا تم نے؟

سیاہ فام : آپ اسے پکڑ لیں اور......

(سیاہ فام دایاں ہاتھ یوں لہراتا ہے جیسے کہہ رہا ہو "اس کی گردن اڑا دیں"!)

پہلا افسر : یہ تو ہوگا ہی ۔ مگر تم نے کیا سوچا ہے؟

سیاہ فام : وہ ـــ بڑا خطرناک آدمی ہے ـــ آپ کا بڑا ـــ بہت دشمن ہے۔

پہلا افسر : تمہارا بھی تو بڑا خطرناک دشمن ہے۔

سیاہ فام : ہاں

(دوسرا افسر پہلے افسر کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کر دیتا ہے)

دوسرا افسر :- یہی ہو گا —

(دوسرا افسر وہی اشارہ کرتا ہے جو سیاہ فام نے "اس کی گردن اڑا دیں" کے مفہوم کے لئے کیا تھا — سیاہ فام کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتی ہیں۔)

اگر اسے مارا نہ گیا تو تمہیں پکڑ لے گا — اور مار ڈالے گا۔

(سیاہ فام کا چہرہ لٹک جاتا ہے)

مگر ہم اسے ایسا نہیں کرنے دیں گے — ہم چاہتے ہیں یہاں تمہاری حکومت ہو۔

(سیاہ فام مسکراتا ہے۔ دوسرا افسر بھی مسکراتا ہے۔)

اس کے لیے تمہیں کچھ کام کرنا ہو گا — یہ کام صرف تمہیں کر سکتے ہو!

(دوسرا افسر خاموش ہو کر اس کے چہرے کا تجزیہ کرتا ہے۔ سیاہ فام نے اوپر کے ہونٹ کو اوپر کے دانتوں تلے دبا کر نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ دیا ہے — پہلا افسر کمرے میں پھرنے لگتا ہے۔)

سیاہ فام : کیا کام ؟

دوسرا افسر : اسے یہاں سے لے جانا ہو گا۔ رات کی تاریکی میں — ایک ایسی جگہ جہاں کوئی آبادی نہ ہو —

(سیاہ فام اس انداز سے اسے دیکھتا ہے، گویا پوچھ رہا ہے "بس یہی کام ہے؟")

پہلا افسر : یہ کام کر سکو گے ؟

سیاہ فام : ہاں !

دوسرا افسر : تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(پہلا افسر انگیٹھی کے قریب جا کر مجسمے کو دیکھنے لگتا ہے۔ دوسرا افسر سیاہ فام کا

ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھا دیتا ہے۔ اور خود بھی اس کے سامنے ایک کرسی

میں بیٹھ جاتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

قریب قریب آدھی رات کا وقت۔

ایک بیابان۔

چاروں طرف ہلکی ہلکی روشنی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دور سے

کسی جانور کی دردناک آواز آتی رہتی ہے۔

سٹیج کے وسطی حصے میں وہی دو سفید فام افسر۔

پہلا افسر دائیں جانب کھڑا ہے اور وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے،

جیسے سخت بے چینی کے عالم میں ہو۔

دوسرا افسر اس کے پہلو میں نظر آ رہا ہے۔

اس کی حالت نسبتاً پرسکون ہے۔ ہاتھ میں ٹارچ

چند لمحوں کے لیے سٹیج پر یہی عالم رہتا ہے۔

دائیں جانب سے پست قد سیاہ فام آتا ہے۔)

پہلا افسر :- کہاں ہے؟

سیاہ فام :- ابھی ابھی — یہاں آجاتا ہے!

پہلا فام :- کیوں نہیں آیا ابھی تک؟

سیاہ فام :- آ رہا ہے۔

پہلا افسر :- کب آ رہا ہے؟

دوسرا افسر پہلے افسر کے شانے پر اپنی چھڑی بہت ہلکے سے مارتا ہے۔ کسی قدر
دور سے جیپ کے چلنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے
تینوں بائیں جانب چلے جاتے ہیں۔
اب سٹیج خالی ہے۔
قریب سے جیپ کی آواز اور سیٹیوں کا مسلسل شور سنائی دے رہا ہے۔
دائیں جانب سے چند سفید فام سپاہی سٹین گن اٹھائے کالے آدمی ،کو
اپنے نرغے میں لیے سٹیج پر آتے ہیں۔
کالا آدمی 'دراز قد ہے ، سفید کوٹ پتلون میں ملبوس ،لمبی لمبی مونچھیں ،
چھوٹی سی ڈاڑھی۔ آنکھوں پر عینک۔ ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔
'کالا آدمی' بڑے وقار سے قدم اٹھا رہا ہے۔
جب وہ پوری طرح سٹیج پر پہنچ جاتے ہیں تو بائیں جانب سے دونوں
سفید فام افسروں اور ان کے ساتھ پست قد سیاہ فام آتا ہے۔
سپاہی پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔
ان کی سٹین گنوں کا رُخ کالے آدمی' کی طرف ہے۔
پہلا افسر کالے آدمی کی طرف دیکھتا ہے جس کے جواب میں کالا آدمی بڑی
حقارت اور نفرت آلود نگاہوں سے اُسے دیکھتا
دونوں دو تین لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔
پہلا افسر گرجتا ہے ــــ
"فائر" !
سپاہی گولیاں برسانے لگتے ہیں۔
'کالا آدمی' دھم سے زمین پر گر پڑتا ہے۔

وہ خون میں ڈوبا ہوا ہے — سپاہیوں نے گولیاں برسانی بند کر دی ہیں۔

پہلا افسر اپنا پستول نکالتا ہے — آگے بڑھتا ہے پستول کا رخ کالے آدمی کی خون آلود لاش کی طرف کرتا ہے اور دھڑا دھڑ گولیاں برسانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا پستول خالی ہو جاتا ہے۔

خالی پستول وہ زور سے لاش پر مارتا ہے اور فاتحانہ انداز میں دوسرے افسر کو دیکھتا ہے۔

خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔

دوسرے افسر کا چہرہ متبسم ہے۔

پہلا افسر دائیں ہاتھ سے لاش کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگاتا ہے۔

"یسوع مسیح — یسوع مسیح — افریقہ کا نجات دہندہ!"

وہ اور زور سے قہقہہ لگاتا ہے — اور اسی عالم میں پردہ گرتا ہے۔

تیسرا منظر

وہی سجا سجایا کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے — اس وقت میز پر طرح طرح کی شراب کی بوتلیں چمک رہی ہیں۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے دونوں افسر ہاتھوں میں پیگ اٹھائے میز کے گرد کھڑے ہیں۔ مسرت ان کی آنکھوں سے ٹپک رہی ہے۔

دور کسی کمرے میں فوجی بینڈ کا ریکارڈ بج رہا ہے اس سے
پہلے کہ وہ پیگ ہونٹوں سے لگائیں سیکرٹری ٹرے میں اخبارات
کا ایک انبار اٹھائے دروازے پر آتا ہے۔ حسبِ معمول مؤدبانہ
سر جھکاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔

پہلا افسر جلدی سے پیگ خالی کرکے سیکرٹری کی طرف
بڑھتا ہے۔ پیگ نیچے قالین پر گرما دیتا ہے۔)

پہلا افسر :۔ کیا کہتے ہیں یہ لوگ ؟

(سیکرٹری کوئی جواب نہیں دیتا۔)

ہمارے خلاف شاید لکھ رہے ہوں گے؟

(سیکرٹری اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ پہلا افسر اخبار کے پہلے
صفحے پر سرسری نظر ڈالتا ہے۔)

اور کیا کہتے ہیں ؟

سیکرٹری :۔ جی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے !

پہلا افسر :۔ ہمارے خلاف کیا ؟

سیکرٹری :۔ جی ہاں !

(دوسرا افسر آہستہ آہستہ پیگ خالی کر رہا ہے۔)

دوسرا افسر :۔ وہ خبر چھپی ؟

سیکرٹری :۔ جناب کی مراد اس خبر سے ہے کہ اسے گاؤں کے.... لوگوں نے
مار دیا ہے۔

پہلا افسر :۔ اور کیا خبر ہو گی ؟

سیکرٹری :۔ سب اخباروں میں چھپی ہے !

پہلا افسر: تو —؟

(سیکرٹری جواب دینے میں ہچکچاتا ہے۔)

تو کیا ردِ عمل ہے اس کا؟

سیکرٹری: لوگ اسے صحیح نہیں سمجھتے۔

پہلا افسر: کیا کہتے ہیں؟

سیکرٹری: کہتے ہیں قتل کی ذمہ داری ہم پر ہے — اور یہ خبر ایک سازش کا نتیجہ ہے۔

دوسرا افسر: ۔ (بے نیازی سے) کہنے دو — بکنے دو، بکنے دو — جو جی میں آتا ہے کہنے دو۔

پہلا افسر: یہ لوگ ہوتے کون ہیں ہمارے معاملے میں دخل دینے والے؟

(پہلا افسر پستول پر ہاتھ رکھ دیتا ہے، اور زمین پر زور سے پاؤں مارتا ہے)

میرے بس میں ہو تو ان سب کو گولی سے اڑا دوں۔

(دوسرا افسر قہقہہ لگاتا ہے — سیکرٹری مسکراتا ہے۔ مگر بڑی جلدی اس کی مسکراہٹ غائب ہو جاتی ہے۔)

دوسرا افسر: اب کیا فکر ہے، بکنے والوں کو بکنے دو۔ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں — کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

(دوسرا افسر سیکرٹری سے مخاطب ہوتا ہے۔)

لے جاؤ ان چیتھڑوں کو — فو — راً — فو — راً۔

(چھڑی ذرا زور سے ہتھیلی پر مارتا ہے۔ پہلا افسر اخبار مروڑ تروڑ کر گیند سی بنا کر پرے پھینک دیتا ہے۔ سیکرٹری مودبانہ سر جھکاتا ہے اور جانے لگتا ہے۔ پہلا افسر ٹہلنے لگتا ہے۔ انگیٹھی سے واپس آتا

ہے تو اخبار کی گیند کو زور سے کک مارتا ہے۔ گیند اڑ کر پرے

جا گرتی ہے۔)

سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ ہماری منشا کے مطابق — ہم یہی چاہتے تھے — بہت بڑا خطرہ ٹل گیا ہے — وہ خوف ناک آواز ڈوب گئی ہے — ہمیشہ ہمیشہ کے لئے — اور کیا چاہیئے — یہی ہمارا مقصد تھا — یہی ہماری خواہش تھی۔

پہلا افسر:۔ اور یہ اخبار — ؟

(دوسرا افسر ایک حقارت انگیز قہقہہ لگاتا ہے)

دوسرا افسر:۔ وہ دن ایک تاریخی دن تھا جب وہ کالا آدمی مارا گیا تھا اس دن سے تاریخ کا پورا دھارا بدل گیا ہے۔

(دوسرا افسر پیا پیگ بھرتا ہے اور جلدی سے دو گھونٹ لے کر پرے پھینک دیتا ہے۔)

ہم کہتے ہیں تاریخ کا دھارا بدل گیا ہے۔ تاریخ نے اپنا رُخ تبدیل کر لیا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا دشمن مر گیا ہے — ختم ہو گیا ہے — پاش پاش ہو چکا ہے۔

(دوسرا افسر چھڑی کو ہوا میں لہراتا ہے۔)

تم جانتے ہو — وہ — وہ کالا آدمی پورے مشرق کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا۔ اس کے سینے میں آندھیوں کا خروش اور طوفانوں کا جلال تھا — آج وہ سینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔

پہلا افسر: ٹکڑے ٹکڑے — آہا ہا ہا ہا — ہم نے کیا ہے وہ سینہ ٹکڑے ٹکڑے، آہا ہا ہا ہا۔

(دوسرا افسر اس سے لپٹ کر اس کا دایاں رخسار زور سے چوم لیتا ہے)

دوسرا افسر: تم ہمارے ہیرو ہو —— ہیرو — گریٹ ہیرو —

(دوسرا افسر پہلے افسر کو پھر گلے لگا کر اس کا بوسہ لیتا ہے۔ دائیں دروازے سے پست قامت سیاہ فام داخل ہوتا ہے۔ انہیں اس عالم میں دیکھتا ہے تو دونوں بازو پھیلا کر زور سے چلاتا ہے۔)

"ہو ہو ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا — ہا ہا"

پہلا افسر: (زور سے) مرگیا۔

(پہلا افسر جوشِ مسرت سے ہاتھ ہوا میں لہراتا ہے)

دوسرا افسر: مرگیا!!

(دوسرا افسر بیگ پورے زور سے دیوار پہ مارتا ہے)

سیاہ فام: ہو ہو — ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا — ہا ہا

(یکایک دور سے آواز بلند ہوتی ہے جو پہلے منظر میں سنائی گئی ہے۔

"جاگ اٹھا ہمارا افریقہ"!)

(پہلا افسر چونک سا پڑتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ سیاہ قامت خالی بیگ دیوار پہ مار کر اسی انداز میں دانت باہر نکال کر ہو ہو — ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا — ہا ہا کرتا ہے ابھی اس کی آواز کا تسلسل جاری ہے کہ یکایک پہلے افسر کو ایک عجیب انداز میں دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ دوسرا افسر بھی آواز سن رہا ہے۔

آواز بلند ہو گئی ہے —

جاگ اٹھا ہمارا افریقہ

ظلم کی کالی رات بیت گئی

لو وہ نکلا ہے مہرِ آزادی

لو وہ جاگے غلام صدیوں کے

لو وہ بھاگے سفید فام آقا

آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے —

روک سکتا ہے کون طوفاں کو

یکایک سامنے کا دروازہ زور سے کھلتا ہے اور وہی دراز قد عینک والا — "کالا آدمی" آتا ہے جس کے مردہ جسم پر پورا پستول خالی کیا گیا تھا — وہ لہولہان ہے — سینے سے خون بہہ رہا ہے۔ دونوں بازو صلیب کی طرح دائیں بائیں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے —

"جاگ اٹھا ہمارا افریقہ!"

کہتی ہوئی بہت سی آوازیں گونج اٹھتی ہیں — جیسے جیسے یہ شخص آگے بڑھتا جائے گا آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جائینگی۔

تینوں حیران، سراسیمہ ہو کر اسے دیکھتے ہیں —

'کالا آدمی' بڑے وقار سے آگے بڑھتا ہے۔ پہلا افسر پستول نکالتا ہے۔ اس کا رُخ کالے آدمی کی طرف کرتا ہے اور دھڑا دھڑ فائر کرنے لگتا ہے۔ گولیاں مسلسل اس شخص کے سینے پر

گر رہی ہیں مگر وہ برابر اسی شان، اسی تجمل سے آگے بڑھ رہا ہے

آگے بڑھتا رہتا ہے —

چاروں طرف —

"جاگ اٹھا ہمارا افریقہ!"

کی آوازوں کا طوفان برپا ہے۔ پہلے افسر کا پستول خالی ہو چکا ہے

تینوں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے ہیں —

اسی اثنا میں پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

جب دوبارہ پردہ اٹھتا ہے تو آوازوں کا طوفان اسی طرح برپا ہے۔

وہی کمرہ سامنے ہے — 'کالا آدمی' نظر نہیں آتا۔ تینوں مبہوت کھڑے ہیں۔ پہلے افسر کے ہاتھ میں خالی پستول نظر آ رہا ہے — سیکرٹری اندر آتا ہے۔ تینوں کو سراسیمگی کے ساتھ دیکھتا ہے۔ دائیں ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے۔ یکایک اس کی نظر سامنے کے دروازے پر پڑتی ہے جس کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔

اچانک اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ وہ قالین پر ایک چمکتی ہوئی چیز دیکھتا ہے۔ ادھر جاتا ہے — جھکتا ہے۔ مڑتا ہے اور ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ بلند کرتا ہے۔ ان ہاتھوں میں

یسوع مسیح کے مجسمے کے ٹکڑے ہیں — اس کے ہاتھ اسی انداز میں پھیلے رہتے ہیں۔

تینوں اس طرح مجسمے کے ٹکڑوں کو دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہوں —

سیکرٹری کے ہاتھ ابھی تک بلند ہیں — آوازوں کا طوفان جاری ہے۔

اور پردہ گرتا ہے)

مٹی کا دیا

"میں ماضی کے اندھیرے غاروں میں اتر رہا
ہوں اور میرے ہاتھ میں مٹی کا ایک دیا ہے
جو میں خود ہوں، جو میرا اپنا وجود ہے
جو میری ذات، میری روح ہے ——"

میرزا ادیب کی .....

آپ بیتی!

سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور